مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول (مولانا) مشرف علی تھانوی

مدیر ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۱۹ | جمادی الثانی ۱۴۳۹ھ | مارچ ۲۰۱۸ء | شمارہ ۳

ازالۃ الغین عن آلۃ العین

آنکھوں سے غفلت کا پردہ دور کرنا

از افادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۴۰ روپے زرسالانہ =/۴۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور

۳۵۴۲۲۲۱۳ ۳۵۴۳۳۰۴۹

پتہ دفتر جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ

۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) مشرف علی تھانوی

مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس

۲۰/۱۳ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور

مقام اشاعت

جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

ازالۃ الغین عن آلۃ العین

(آنکھوں سے غفلت کا پردہ دور کرنا)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱.....	تمہید.....	۹
۲.....	آیات قرآنی میں ربط کی مثال.....	۱۰
۳.....	علمی فائدہ.....	۱۲
۴.....	کھانا رکھنے میں تکلف.....	۱۳
۵.....	کھانے میں تکلف.....	۱۴
۶.....	امیر معاویہ کی مہمان نوازی.....	۱۵
۷.....	آدابِ مہمان نوازی.....	۱۵
۸.....	کھانے میں طبیعت کی رعایت.....	۱۷
۹.....	ترتیب آیات قرآنی کی مثال.....	۱۸
۱۰.....	نعم وقسم دونوں کے بعد آیت فبای الآء کے تکرار میں حکمت	۱۸
۱۱.....	مؤمنین کے لئے وجود دوزخ نعمت ہے.....	۲۰
۱۲.....	کلام اللہ کی خوبی.....	۲۱
۱۳.....	ایک مضمون کو مختلف عنوانات سے بیان کرنے کا فائدہ...	۲۲
۱۴.....	ترتیب تلاوت وترتیب سور.....	۲۳
۱۵.....	عمل صالح کا فائدہ.....	۲۴
۱۶.....	انسان کی شکایت.....	۲۵
۱۷.....	طریقت کی حقیقت.....	۲۶
۱۸.....	صحبت اہل طریق کی ضرورت.....	۲۷

۱۹.....	قساوت کی حقیقت.....	۲۸
۲۰.....	نرم دلی کی حقیقت.....	۲۹
۲۱.....	حکایت.....	۳۰
۲۲.....	کفار کو خطاب.....	۳۱
۲۳.....	مسلمانوں کو تنبیہ.....	۳۲
۲۴.....	عنایات ربانی.....	۳۳
۲۵.....	اہل ذوق کا حال.....	۳۳
۲۶.....	موقع قسم پر کلمہ ''لا'' لانے کا نکتہ.....	۳۴
۲۷.....	غلبہ حقیقت کے آثار.....	۳۴
۲۸.....	علم حقیقی.....	۳۵
۲۹.....	عبادت کا بہترین وقت.....	۳۷
۳۰.....	عشّاق کا حال.....	۳۷
۳۱.....	ایک نحوی کا حال.....	۳۸
۳۲.....	منطقیوں کی حکایات.....	۳۹
۳۳.....	بنیوں کی حکایات.....	۴۰
۳۴.....	علماء ظاہری اور علماء معانی میں فرق.....	۴۰
۳۵.....	مخلوقات کی قسم کھانے میں حکمت.....	۴۱
۳۶.....	مقسم بہ اور مقسم علیہ میں تعلق.....	۴۲
۳۷.....	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاک پا کی قسم.....	۴۳
۳۸.....	تشریح حدیث.....	۴۳
۳۹.....	لفظ عشق کے استعمال کی ممانعت.....	۴۴

۴۰.....	شعراء کی بے اعتدالیاں.....	۴۵
۴۱.....	''لا اقسم'' کی دوسری توجیہ.....	۴۶
۴۲.....	بخلاء کی حکایات.....	۴۷
۴۳.....	ماں باپ کی مشقت.....	۴۸
۴۴.....	بچوں پر مشقت.....	۴۸
۴۵.....	حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذکاوت.....	۵۰
۴۶.....	ہر چیز شان خداوندی کا مظہر ہے.....	۵۱
۴۷.....	جواب دینے کے آداب.....	۵۳
۴۸.....	قرآن کریم کے جوابات.....	۵۵
۴۹.....	حکیم الامت کا حاکمانہ جواب.....	۵۶
۵۰.....	علماء کی شان.....	۵۷
۵۱.....	اہل اللہ کا حال.....	۵۸
۵۲.....	عاشق حقیقی کا حال.....	۵۹
۵۳.....	اللہ کے ہوجاؤ.....	۶۰
۵۴.....	انسان کی حماقت.....	۶۲
۵۵.....	علمی نکتہ.....	۶۳
۵۶.....	دوسرا نکتہ.....	۶۴
۵۷.....	تیسرا نکتہ.....	۶۵
۵۸.....	بے محل سوال.....	۶۶
۵۹.....	مدرِکات ثلاثہ.....	۶۷
۶۰.....	حکماء کی پریشانی.....	۶۹

۶۱.....	آنکھ قدرت خداوندی کا مظہر.....	۷۰
۶۲.....	موثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں.....	۷۴
۶۳.....	غلط فہمی کا ازالہ.....	۷۵
۶۴.....	مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع.....	۷۶
۶۵.....	آنکھیں بڑی نعمت ہیں.....	۷۷
۶۶.....	دو آنکھیں ہونے کی خوبی.....	۷۸
۶۷.....	تفہیم حدیث.....	۷۸
۶۸.....	آنکھوں کی دوسری خوبی.....	۷۹
۶۹.....	آنکھوں کی سب سے بڑی خوبی.....	۸۰
۷۰.....	بینائی پر شکر کا طریقہ.....	۸۰
۷۱.....	لسان اور شفتین کے ذکر کا فائدہ.....	۸۱
۷۲.....	خلاصہ وعظ اور دعاء.....	۸۱

وعظ

ازالۃ الغین عن آلۃ العین

(آنکھوں سے غفلت کا پردہ دور کرنا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم .اما بعد

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے وعظ'' ازالۃ الغین عن آلۃ العین '' ۲۲ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ اپنی بڑی اہلیہ کی فرمائش پر ان کے گھر میں ۴ گھنٹے تک ارشاد فرمایا بڑی اہلیہ کی بینائی جاتی رہی تھی گھر علاج کے بعد واپس آ گئیں اس کے شکریہ کے طور پر وعظ کہا گیا جس میں اللہ تعالیٰ کے انعامات کو ذکر فرمایا اور خاص طور پر آنکھوں کے نعمت ہونے کو بیان کیا اور اس بات پر زور دیا کہ اللہ کی عطاء کردہ نعمتوں کو اس کی اطاعت میں استعمال کیا جائے نافرمانیوں میں نہ کیا جائے مولانا عبدالکریم صاحب گمتھلوی نے قلم بند فرمایا سامعین میں ۱۰۰ مرد اور گھر میں عورتیں اس کے علاوہ تھیں ہر طبقہ کو مفید ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس وعظ سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۲۴/ ربیع الاول ۱۴۳۹ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی اٰلہ واصحابہ و بارك وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿لَآ اُقۡسِمُ بِھٰذَا الۡبَلَدِ ۙ وَاَنۡتَ حِلٌّۢ بِھٰذَا الۡبَلَدِ ۙ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۙ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ ؕ اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡہِ اَحَدٌ ۘ یَقُوۡلُ اَھۡلَکۡتُ مَالًا لُّبَدًا ؕ اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ یَرَہٗۤ اَحَدٌ ؕ اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّہٗ عَیۡنَیۡنِ ۙ وَلِسَانًا وَّشَفَتَیۡنِ ۙ وَھَدَیۡنٰہُ النَّجۡدَیۡنِ ۚ﴾(۱)

تمہید

یہ چند آیتیں ہیں سورہ بلد کی۔ اس سورت کا نام بلد ہے کیونکہ اسمیں ایک بلد خاص(۱) کا ذکر ہے یعنی شہر مکہ معظّمہ کا اور اس وقت ان آیات میں مقصود بالبیان(۲) صرف اخیر کی ایک آیت ہے یعنی اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّہٗ عَیۡنَیۡنِ مگر یہ آیت مربوط ہے (۳) اول وآخر کے ساتھ اس لئے ساری آیتوں کی تلاوت کی گئی اور بیان سب کا کیا جاویگا گو تمہید کے طور پر ہوگا اور یہ تمام سورت ایک ہی مضمون کے

(۱) سورۃ البلد: ۱۔۱۰ (۱) خاص شہر (۲) بیان کا مقصود (۳) مگر اس کا ربط آیت گذشتہ وآئندہ سے ہے۔

واسطے سوق (۱) کی گئی ہے باقی سب اجزاء اُس مضمون کے متمم ہیں (۲) اور وجہ اس آیت کے اختیار کی جو کہ سبب ہے اس وعظ کا ایک خاص واقعہ ہے وہ یہ کہ میرے بڑے گھر میں (۳) کی بینائی (۴) جاتی رہی تھی اب بحمداللہ تعالیٰ بینائی عود (۵) کر آئی ہے ظاہراً اسباب ظاہری سے اور حقیقتاً فضل خداوندی سے۔ اور انہوں نے ارادہ کیا تھا کہ اس خوشی میں بیان کراؤنگی چونکہ داعی اس وقت ایک خاص نعمت ہے اس لئے بیان میں وہی آیت مقصود ہے، جس میں اس نعمت کا ذکر ہے اور مربوط (۶) ہونے کے سبب سب آیتوں کی تلاوت کردی گئی اور مقصود سورت کا یہ ہے کہ انسان اکثر نعم وقسم (۷) سے متاثر نہیں ہوتا اور یہ مقصود نہایت ضروری ہے اور حقیقت میں مقصود معلوم ہوجانے سے کلام کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے اور ارتباط آیات بھی خوب واضح ہوجاتا ہے ورنہ چکر ہی میں رہ جاتے ہیں کہ اس آیت کا اس مقام سے کیا جوڑ ہے مگر مقصودِ کلام معلوم کرنے کے لئے ذوق سلیم اور نقل عن السلف (۸) کی ضرورت ہے یعنی دونوں امر جمع ہوکر کام چلتا ہے۔ اور میرے نزدیک یہ بڑا علم ہے کیونکہ جب تک مسوق لہ الکلام (۹) نہ معلوم ہوجائے نہ تو لطف آتا ہے نہ پوری طرح تفسیر سمجھ میں آتی ہے اور یہ بات اہل علم کو اجمالاً تو معلوم ہی ہے مگر تفصیلاً ان تفاسیر کے دیکھنے سے معلوم ہوسکتی ہے کہ جن میں سیاق وسباق (۱۰) بیان کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے کہ اس کے بعد سب اشکال حل ہوجاتے ہیں۔

آیات قرآنی میں ربط کی مثال

اس کی ایک مثال بیان کرتا ہوں ﴿ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى

(۱) ایک ہی مضمون بیان کرنے کے لئے نازل کی گئی (۲) اس کی تکمیل کرنے والے ہیں (۳) بڑی بیگم (۴) آنکھوں کی روشنی (۵) لوٹ آئی (۶) آیات میں باہم ربط ہونے کی بنا پر سب کی تلاوت کی گئی (۷) نعمتوں اور مصیبتوں سے (۸) متقدمین سے منقول ہونے کی (۹) یہ نہ معلوم ہو کہ یہ کلام کس وجہ سے لایا گیا (۱۰) آیات قرآنی میں باہم ربط بیان کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا﴾(۱) یعنی اللہ تعالیٰ مومنوں پر کفار کو ہرگز غالب نہ کریگا۔ اس میں مصنفین نے اس اشکال کو خواہ مخواہ اپنے سر لے لیا ہے کہ حق تعالیٰ نفی تابیدی وتاکیدی(۲) کے ساتھ فرمارہے ہیں کہ کفار غالب نہ ہوں گے لیکن مشاہدہ اس کے خلاف ہے کیونکہ بہت امکنہ وازمنہ(۳) میں کافر غالب ہوئے ہیں چونکہ سباق (بالباء الموحدہ) پر نظر نہ کی اس لئے اس اشکال کو اپنے ذمہ لے لیا اور توجیہات شروع کردیں اور زیادہ مشہور توجیہ یہ ہے کہ محاجہ باللسان(۴) مراد لیا جاوے یعنی مسلمان ہمیشہ غالب فی الحجت رہیں گے(۵) اور غلبہ بالابدان وباللسان مراد نہیں(۶) اور گویا یہ مسئلہ محاجہ باللسان(۷) میں غالب رہنے کا مستقل طور پر صحیح ہے اور دلائل سے ثابت ہے مگر گفتگو یہ ہے کہ یہ اس آیت کا مدلول بھی ہے یا نہیں سو سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کو اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اوپر ذکر ہے کفار کا اُن کی مذمت ہے پھر فرماتے ہیں فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ یعنی جو اختلاف مومن اور کافر میں ہے حق تعالیٰ اس کا عملی فیصلہ قیامت میں کردیگا کہ مومنوں کو جنت میں اور کافروں کو دوزخ میں داخل کریگا اس کے بعد فرمایا ہے: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ الخ ای فی هذا الحکم یعنی اس فیصلہ مذکورہ میں مسلمان ہی غالب رہیں گے اس سے آیتوں میں ربط بھی ہوگیا اور معنی بھی صحیح اور لطیف ہوگئے۔ اب فرمائیے کہ کیا اشکال رہا۔ حاصل یہ کہ یہ آیت آخرت کے متعلق ہے اور کفار وہاں کبھی غالب نہ ہوں گے اُس فیصلہ میں کفار کے غلبہ کا احتمال ہی نہیں بلکہ سب کے سب کافر ہاریں ہی گے اور ضرور ہاریں گے اور دنیوی ہار جیت کی بابت یہ آیت ہے ہی نہیں جو کفار کو غالب دیکھ کر شبہ ہو اور جواب کی زحمت اُٹھانی پڑے۔ یہ نمونہ ہے اور تفصیل اُن تفاسیر سے معلوم ہوگی جنہوں نے سیاق وسباق بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

(۱) سورۃ النساء:۱۴۱ (۲) ہمیشہ کی ممانعت تاکید سے کررہے ہیں (۳) بہت دفعہ اور بہت جگہ (۴) اس کی مراد زبانی دلائل ہیں (۵) دلیل میں غالب رہیں گے (۶) جنگ وجداں میں غالب آنا مراد نہیں (۷) دلائل میں غالب رہنے کا مسئلہ اپنی جگہ درست ہے۔

غرض اس سے سب اشکال رفع ہوجاتے ہیں اس لئے میں مشورہ دیتا ہوں کہ اس کو ضرور معلوم کیا کریں کہ مسوق لہ الکلام کیا ہے (اور مطولات دیکھنے کی ہمت نہ ہو تو بیان القرآن ہی دیکھ لیں کہ اُس میں باوجود مختصر ہونے کے ہر جگہ مسوق لہ الکلام بیان کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے) اور سیاق وسباق معلوم نہ ہونے سے یہ بھی کمی رہتی ہے کہ اکثر جگہ آیتیں غیر مربوط معلوم ہوتی ہیں چنانچہ یہاں سورۃ بلد کی بھی آیتیں بظاہر غیر مربوط معلوم ہوتی ہیں مگر بیان سے معلوم ہوجاویگا کہ سب مربوط ہیں۔

علمی فائدہ

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اول قسم کھا کر انسان کی حالت بیان فرمائی ہے اور پھر اپنی نعمتوں کا بیان کیا ہے کہ اُن کو دیکھ کر اور سوچ کر اپنی حالت درست کرنی چاہئے مناسبت مقام کے سبب ایک علمی فائدہ ربط آیات کے متعلق استطراداً بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ قرآن شریف میں وقوع ارتباط کی نفی کرنا تو بالکل غلط ہے(۱) اس باب میں کافی ذخیرہ موجود ہے چنانچہ خود میرا بھی ایک رسالہ ہے ''سبق الغایات فی نسق الآیات'' البتہ اگر لزوم ارتباط کی نفی کی جاوے تو صحیح ہے(۲) کیونکہ نسخوں کی بیاض میں ارتباط ضروری نہیں بلکہ ارتباط کتابوں میں ضروری ہے نسخہ تو کیف ما اتفق مریض کے مطابق لکھا جاتا ہے کیا مطب میں یہ ہوتا ہے کہ جب تک حکیم صاحب مرض سر کے متعلق تمام نسخے مریضوں کو نہ دے لیں اس وقت تک کوئی دوسری قسم کا مریض نہ آوے یا آوے تو اس کا علاج نہ کیا جاوے اور کہدیا جاوے کہ ابھی تمہارے مرض کا نمبر نہیں آیا ہے، ہرگز نہیں۔ بلکہ مطب میں یہی ہوتا ہے کہ جو مریض آتا ہے اس کے مطابق نسخہ لکھ دیا جاتا ہے خواہ اُس سے پہلے کسی نوع کے مرض کا نسخہ لکھا ہو۔ اور کتابوں میں یہ ہوتا ہے کہ جب تک ایک مرض کی بحث ختم نہ

(۱) اس بات کا انکار کرنا کہ قرآنی آیات میں باہم ربط نہیں ہے غلط ہے (۲) البتہ اگر یہ کہا جائے کہ ربط کے بیان کا التزام نہیں ہے تو درست ہے۔

ہولے دوسری بحث شروع نہ کریں پس اول تو یہ بات ہے کہ قرآن شریف حسب ضرورت تدریجاً نازل ہوا ہے اس میں ربط کی ضرورت ہی کیا ہے۔ دوسرے، ربط تو اسباب حسن میں سے ایک خاص سبب ہے اور جو اپنی ذات میں حسین ہو اس کو اسباب حسن کی ضرورت ہی کیا ہے بلکہ خود اسباب حسن محتاج ہیں اُس کے ساتھ تلبس کے ؎

دلفریباں نباتی ہمہ زیور بستند دلبر ماست کہ باحسن خداداد آمد(۱)
نباشد اہل باطن درپے آرایش ظاہر بنقاش احتیاجے نیست دیوار گلستاں را(۲)

بس اول تو ضرورت ہی نہیں اسباب حسن کی پھر کسی خاص سبب پر حسن موقوف نہیں کسی نے اردو میں کہا ہے ؎

نہ کچھ پیری چلی باد صبا کی بگڑنے میں بھی زلف اُس کی بنا کی

دیکھو حسین شخص کے بالوں کی بے ترتیبی میں بھی ایک لطف ہے اور اس کا ناراض ہو کر منہ بگاڑ کر چل دینا بھی ایک ادا اور انداز شمار کیا جاتا ہے ؎

خوبی ہمیں کرشمہ ذمازو خرام نیست بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست(۳)

کھانا رکھنے میں تکلف

لذیذ اطعمہ (۴) ہی کو لیجئے کہ اُن کے رکھنے میں بھی کسی ترتیب کی ضرورت نہیں گو لوگ تکلف کرتے ہیں اور یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ ایک صاحب نے دسترخواں پر دائروں کے اندر نام کھانوں کے لکھائے تھے کہ اس دائرہ پر پلاؤ ہو اس میں زردہ ہو اس میں فیرنی وغیرہ وغیرہ تاکہ ملازم لوگ رکھنے میں گڑبڑ نہ کریں میں نے بطور لطیفہ کے جرح کیا(۵) کہا اگر ان لکھے ہوئے کھانوں میں ایک کھانا کم ہو تو یہ دسترخواں نہیں بچھ سکتا یا بچھے تو اُس خالی جگہ میں غیر موجود کھانے

(۱) لوگوں کے محبوب میک اپ کے محتاج ہیں میرا محبوب خداداد حسن رکھتا ہے اس کو کسی میک اپ کی ضرورت نہیں (۲) اہل باطن ظاہری خوبصورتی کے پیچھے نہیں پڑتے نقاشی کو باغ کی دیوار کی ضرورت نہیں ہے (۳) یہ ناز نخرہ ہی صرف میرے محبوب کی خوبی نہیں ہے محبوبوں کی کتنی ہی ادائیں ہیں جن کا کوئی نام ہی نہیں (۴) عمدہ کھانے (۵) اعتراض کیا۔

کا نام دیکھ کر سب ترسا کریں شاید اُس کو ڈھانک دیتے ہوں خیر یہ تو تکلفات ہیں کہ وضع اطعمہ میں (۱) ترتیب کا اہتمام کیا جاوے۔ دراصل اس کی ضرورت نہیں اور اگر ترتیب کی کوشش بھی کی تو صرف رکھنے میں ہوسکتی ہے استعمال میں ترتیب کا رہنا ضروری نہیں کیونکہ ہر شخص اپنی رغبت کے موافق کھائیگا اور اسی میں لطف بھی ہے ورنہ یہ کیا کھانا ہوا کہ جی چاہتا ہے پہلے میٹھے کو اور کھایا جارہا ہے نمکین یا بالعکس یہ تو بڑی بدمزگی کی بات ہے اسی واسطے اہل دانش اجازت دیدیا کرتے ہیں کہ جس طرح رغبت ہو بلا تکلف کھائے اور واقعی زوائد کے درپے ہونے میں کھانا دشوار ہوجاتا ہے اور سخت تکلیف ہوتی ہے پھر نفع کیا ہوا اس خرافات سے جبکہ مقصود اصلی حاصل نہ ہوا یعنی مہمان کا انبساط طبعی (۲)۔

کھانے میں تکلف

چنانچہ مجھ پر یہ قصہ گزرا ہے ایک صاحب سندیلہ کے رہنے والے تحصیلدار تھے کیرانہ میں انہوں نے دعوت کی وہاں جاکر میں مصیبت میں پھنس گیا کھانے تو نہایت لذیذ اور پرتکلف بلکہ بعض ایسے بھی، کہ میں نے کبھی نہ کھائے ہوں گے لیکن انہوں نے بیٹھ کر انتظام شروع کیا، یہ کھایئے، یہ تناول فرمایئے، یہ فلاں چیز ہے، یہ ایسی ہے یہ ویسی ہے اول تو صبر کیا، پھر میں نے کہا کہ آپ بلاتکلف کھانے میں مشغول ہوجایئے میں خود سب چیزوں سے کھالوں گا۔ مگر وہ سمجھے کہ چپ چاپ کھلانے میں بے قدری ہے وہ خاموش نہ ہوئے برابر کچھ نہ کچھ کہتے ہی رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا پیٹ بھی نہ بھرا۔ ایک اور تہذیب زدہ کے ساتھ ایک کھانے میں شرکت ہوگئی وہ بندہ خدا تکلف کے مارے بچہ کا سالقمہ لیتے اور جب اس کو چبا کر نگل لیتے تب دوسرا لیتے مجھ کو بے تکلف کھاتے ہوئے بڑی شرم آئی

(۱) کھانا رکھنے میں ترتیب کا اہتمام کیا جائے (۲) مہمان کی دلی خوشی۔

کہ اگر میں اپنی عادت کے موافق کھاتا ہوں تو یہ کہیں گے کہ کیسا گنوار آدمی ہے غرض ان کے ساتھ ایک گھنٹہ بھر کھایا مگر بھوکا آیا۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی مہمان نوازی

ایک قصہ اور یاد آ گیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بڑے اسخیاء میں سے ہیں اور بخل تو عرب میں بہت ہی کم ہے مثل بلاغت کے کہ اُس سے بھی کم آدمی خالی ہوئے ہیں۔ مگر حضرت معاویہؓ بڑے درجہ کے سخی تھے گویا اس منظر کے مظہر تھے کہ ؎

اویم زمین سفرۂ عام اوست چہ دشمن بریں خواں بغما چہ دوست (۱)

اور آپ کی یہ عادت تھی کہ مہمانوں کی خود خدمت کرتے تھے حسب عادت ایک دفعہ کھانا کھلا رہے تھے ایک اعرابی بے تمیزی سے بہت بڑے بڑے لقمے کھانے لگا حضرت معاویہؓ نے شفقت سے فرمایا کہ بھائی چھوٹا لقمہ لو مبادا کہیں تکلیف ہو جاوے۔ بس یہ سنتے ہی وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور کہا مہمانوں کے لقمے دیکھنا خلاف کرم ہے ایسے دسترخواں پر کوئی شریف نہیں کھا سکتا۔ حضرت معاویہؓ نے ہر چند معافی چاہی اور اصرار کیا کہ بیٹھو کھانا کھالو مگر اس نے نہ مانا اور چلدیا۔ غرض مہمان پر مسلط ہو جانے سے وہ کھا نہیں سکتا شرما جاتا ہے۔

آدابِ مہمان نوازی

اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ کھانے کے برتن میں کم از کم دو آدمی ضرور شریک کئے جاویں ورنہ پتہ لگ جاتا ہے کہ اس نے کم کھایا اس نے زیادہ کھایا اور یہ پردہ داری کے بالکل خلاف ہے البتہ جہاں پوری بے تکلفی ہو وہاں جس طرح چاہیں کریں اور اس قصہ سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بعض اعرابی (۲) ایسی باتیں جانتے ہیں کہ متمدن (۳) لوگ بھی نہیں جانتے۔ ایک اور ادب کھانے کے متعلق۔

(۱) ''اس کا دسترخوان تو سب کے لئے وسیع تھا اس پر چاہے دوست کھائے چاہے دشمن'' (۲) دیہاتی (۳) شہری۔

میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے معمول سے معلوم کیا ہے یہ لوگ واقعی دین میں تو امام تھے ہی دنیا کے بھی امام تھے اور بلاخوف مخالفت کہتا ہوں کہ دنیا کا سلیقہ بھی سیکھنا ہو تو اہل اللہ سے سیکھو اہل دنیا کو سلیقہ کی ہوا بھی نہیں لگی گو دعویٰ کتنا ہی کریں۔ میں نے امام شافعی کا سفرنامہ دیکھا ہے اس میں مذکور ہے کہ جب وہ امام مالک کے یہاں مہمان ہوئے تو خادم نے اول ان کے ہاتھ دھلوانا چاہا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اور ہمارے ہاتھ دھلواؤ۔ اسی طرح کھانا خادم نے پہلے امام شافعی کے سامنے رکھنا چاہا امام مالک نے پہلے اپنے سامنے رکھوایا اور خود کھانا شروع کر کے کہا آپ بھی کھائیے۔ کتاب میں تو فقط یہ قصہ لکھا ہے اور وجہ نہیں لکھی کہ امام صاحب نے ایسا کیوں کیا جو بظاہر اکرام ضیف کے خلاف معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اُن بزرگوں کے فیض سے اور انکی صحبت کی برکت سے میری سمجھ میں اس کی وجہ آ گئی اور بزرگوں کا فیض وفات کے بعد بھی ہوتا ہے برکت بڑی وسیع چیز ہے تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ اہل ظلمت کی تصنیف میں ظلمت ہوتی ہے گو اُس میں نوری ہی باتیں ہوں اور اہل اللہ کی تصنیفات سے ایک نور پیدا ہوتا ہے گو معمولی مضامین ہوں اور ذوق صحیح سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے اہل اللہ کے الفاظ میں ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے نے وعظ کہا وہ علوم سے فراغت کے بعد تشریف لائے تھے بہت حقائق ومعارف بیان کئے مگر مجمع پر کوئی اثر نہ دیکھا خیال ہوا کہ یہ لوگ رقیق القلب نہیں اور ان کو حیرت ہوئی کہ ایسے مضامین نے اثر نہ کیا۔ حضرت غوث اعظم کو یہ خیال مکشوف ہوا اور حاضرین سے خطاب کر کے فرمایا کہ ہم نے رات سحری کے لئے دودھ رکھا تھا وہ بلی نے پی لیا بس ہم نے بے سحری روزہ رکھا یہ سنتے ہی لوگ زارزار رونے لگے۔ صاحبزادے دیکھنے لگے کہ یہ بھی کوئی رونے کی بات تھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ رونے کی بات نہ تھی مگر اُن کے الفاظ میں تاثیر ہوتی ہے۔ از دل خیزد بر دل ریزد(۱) بس جب یہ معلوم

(۱) جو بات دل سے نکلے دل پر اثر کرتی ہے۔

ہوگیا کہاہل اللہ کے الفاظ میں بھی تاثیر ہوتی ہے اور اُن کا یہ فیض باقی رہتا ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ ان کی برکت سے میں نے یہ سمجھا کہ اصل مقصود امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ تھا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو بے تکلف کردیں کہ جتنا انبساط ہوگا اتنا سیر ہوکر کھاوینگے اور ذوق سلیم ہوتو بے تکلف کرنے کا طریقہ سب سے اچھا یہ ہے کہ پہلے خود شروع کردے کیونکہ مہمان کو ابتدا کرتے ہوئے تکلف ہوتا ہے اور حجاب ہوتا ہے اور اصل مقصود تو امام مالک کا اکل میں تقدیم تھی (۱) مگر مقدمات تابع ہوتے ہیں اس لئے اُن میں بھی تبعاً تقدیم کی۔

اب یہاں سے یہ ادب نکلا کہ مہمان کو تکلیف نہ دے اور اپنے طور پر کھانے وغیرہ کا خیال رکھے کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں لیکن اُس پر ظاہر نہ ہو کہ یہ مجھ پر مسلط ہے اور مجھ کو تک رہا ہے (۲) بس سرسری طور پر دیکھنا کافی ہے ٹکٹکی باندھ کر نہ بیٹھ جائے خیر یہ قصہ درمیان میں آ گیا تھا۔

کھانے میں طبیعت کی رعایت

میں اصل میں یہ کہہ رہا تھا کہ اطعمہ میں کسی ترتیب خاص کی ضرورت نہیں ہاں اگر طبی ضرورت کسی کھانے کو مقدم مؤخر کرنے کی ہوتو طبیب کا منصب ہے کہ اس کو بتلادے اور مریض یا حفظ ماتقدم کرنے والے کو اسکا اتباع کرنا چاہئے ورنہ اپنی رغبت کے موافق کھاوے کیونکہ کھانے کے بارے میں مذاق مختلف ہوتے ہیں۔

دیوبند میں مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مٹھائی بہت مرغوب تھی اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کٹھائی کا بڑا شوق تھا۔ دونوں حضرات اپنی اپنی مرغوب شے کے متعلق اشعار لکھتے تھے دلائل بیان کرتے تھے۔ غرض اپنا اپنا مذاق ہے کسی کو کچھ مرغوب ہے کسی کو کچھ۔

(۱) امام مالک کا مقصود اصلی تو کھانے میں پہل کرنا تھا لیکن ہاتھ دھونا اس کا مقدمہ تھا لہٰذا اس میں بھی اپنے ہاتھ پہلے دھلوائے (۲) مجھے گھور رہا ہے۔

ترتیب آیات قرآنی کی مثال

اور درحقیقت قرآن شریف کے واسطے اطعمہ مختلفہ کی مثال بھی پوری مناسب نہیں بلکہ وہ تو مصری کی ڈلی ہے کہ اُس کے سب اجزاء متماثل ہیں (۱) اور جب اجزاء متماثل ہوں تو ترتیب کی ضرورت بالکل ہی نہیں رہتی جس طرف سے اٹھاؤ یکساں لطف ہے البتہ کسی مصلحت کی وجہ سے اپنے سامنے سے کھانے کا امر کیا جاوے تو دوسری بات ہے اور وہ مصلحت بھی اسی پر مبنی ہے کہ جب سب طرف برابر ہے تو پھر اپنے سامنے سے چھوڑ کر دوسری جگہ سے اٹھانا ایک عبث فعل ہے بس اس مصلحت کا لحاظ نہ کیا جاوے تو فی نفسہ کوئی جزو مقصود بالتقدیم نہیں ہوتا اس سے بخوبی واضح ہوگیا کہ خود اجزاء میں ترتیب نہیں بلکہ خارجی وجہ سے ایک طرف سے کھانے کو مقدم کیا گیا ہے پس اسی طرح قرآن شریف کا اصل مقصود ہدایت ہے اس میں سب آیات برابر ہیں اور گو ظاہر میں ایک دوسرے سے مختلف مقاصد رکھتی ہیں مگر مقصود اصلی میں سب متحد ہیں ؎

عبارا تنا شتی وحسنك واحد وكل الى ذاك الجمال يشير (۲)

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش من انداز قدت رامی شناسم (۳)

نعم ونقم دونوں کے بعد آیت فبایٔ الآء کے تکرار میں حکمت

پس قرآن شریف کے اجزاء گو ظاہر میں متنوع ہیں مگر حقیقت میں کچھ اختلاف نہیں ہے سب سے مقصود ایصال الی المقصود ہے (۴) اور یہی وجہ ہے کہ سورۂ رحمٰن میں بیان نقم (۵) کے بعد بھی وہی فرمایا ہے جو بیان نعم (۶) کے بعد فرمایا ہے یعنی ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ یعنی خدا کی کون کونسی نعمت کو جھٹلاتے ہو اس

(۱) ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں (۲) ''ہماری عبارات مختلف ہیں اور تیرا حسن تو یکتا ہے ہر عبارت اسی جمال کی طرف مشیر ہے'' (۳) '' خواہ کسی ہی رنگ کا لباس پہن لو میں قد کے انداز سے پہچان لوں گا''
(۴) مقصود تک پہنچنا ہی ہے (۵) مصیبت (۶) نعمت۔

کی ضروری تفصیل اہل علم کے لئے بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ سورۂ رحمٰن کے اول رکوع میں تکوینی نعم کا بیان ہے اور تیسرے رکوع میں نعم اخرویہ کا اس کے ساتھ تو فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن کا ربط ظاہر ہے لیکن دوسرے رکوع میں نقم کا بیان ہے ان کے ساتھ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن کا بظاہر کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ نعم کے بعد تو فبای آلاء سے خطاب سب کے نزدیک برمحل ہے مگر اکثر لوگ نقم کے بعد فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن پر تعجب کرتے ہیں کہ نقم کے بعد اسکا کیا جوڑ مثلاً جہنم کا ذکر فرمایا اُس کے بعد فرمایا فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن یعنی اپنے رب کی کون کونسی نعمت کو جھٹلاتے ہو اس میں یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا جہنم بھی نعمت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ گو بظاہر مذکور کے درجہ میں جہنم نقمت لیکن ذکر کے درجہ میں وہ نعمت ہے کیونکہ اس کا ذکر ہدایت کے لیے کیا گیا ہے اور نقمت کے ساتھ ظاہر کا لفظ اس واسطے کہا کہ واقع میں خود جہنم بھی نعمت ہے ان شاء اللہ اس کو بھی بیان کردوں گا اس وقت یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ جس طرح جنت کا ذکر کر کے ترغیب دینا نعمت ہے اسی طرح جہنم کا ذکر کر کے ترہیب کرنا بھی نعمت ہے جیسا کہ طبیب کا دوا بتلانا بھی نافع ہے(۱) اور قابل پرہیز اشیاء کی فہرست بتلانا اور اُن کی مضرتیں بیان کرنا بھی نافع ہے۔ سب جانتے ہیں کہ جس طرح حصول خیر میں کوشش کی جاتی ہے اسی طرح شر سے بچنے کا بھی اہتمام ہوتا ہے چنانچہ حضرت حذیفہؓ نے فرمایا ہے کہ اسأله الشر مخافة ان یدرکنی یعنی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شر کے متعلق سوال کیا کرتا اس ڈر کے مارے کہ کہیں مجھ کو شر نہ پہنچ جائے۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

عرفت الشر لا للشر ولکن لتوقیه　　ومن لا یعرف الشر من الخیر یقع فیه (۲)

(۱) مفید ہے (۲) میں شر میں مبتلا ہونے کے لئے اسکی معرفت نہیں حاصل کرتا بلکہ اس لئے حاصل کرتا ہوں کہ شر سے بچ سکوں۔ جو شر اور خیر میں فرق نہیں جانتا وہ شر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

حقیقت میں یہ بھی انعام ہے خدا کا فضل ہے کہ اُس نے ہم کو جہنم سے ڈرایا تا کہ اس سے بچتے رہیں یہ اس مدعا کی تائید تھی کہ گو ظاہر میں مدلولات قرآن کے مختلف اجزاء ہیں مگر مقصود واحد ہے۔

مؤمنین کے لئے وجود دوزخ نعمت ہے

اب اُس کا بیان کرتا ہوں جو میں نے کہا تھا کہ باطن میں دوزخ نعمت ہے اس کے واسطے یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ہر نعمت عام نہیں ہوتی جیسا کہ مشاہدہ خود اسکا شاہد ہے(۱) دلیل کی حاجت نہیں جب یہ بات مسلم ہے(۲) تو سنو کہ دوزخ مومنین کے واسطے نعمت ہے گو کفار کے حق میں عذاب ہے جیسا کہ خود جنت بھی کافر کے حق میں نعمت نہیں بلکہ عذاب ہے اور مومن کے حق میں رحمت ونعمت ہے اگر جنت پیدا نہ ہوتی تو کافر کو اتنی حسرت نہ ہوتی جتنی کہ اب جنت کو دیکھ کر ہوگی اس طرح سے وہ اُس کے لئے آلۂ تعذیب ہے(۳)، اس کی ایسی مثال ہے کہ پیاسے کے پاس پانی لیجا کر ہٹا لیجئے تو حسرت زیادہ ہوگی بہ نسبت اس کے کہ پانی نظر ہی نہ آوے بس جس طرح جنت کافر کے واسطے عذاب ہے یعنی زیادتی تکلیف کا باعث ہے اسی طرح دوزخ مومن کے واسطے مسرت کا باعث ہے مومنوں کو ایک تو یہ مسرت ہوگی کہ جو کفار ہمیں ستاتے تھے وہ سزا بھگت رہے ہیں دوسری ایک یہ فرحت یہ ہوگی کہ خدا نے ہم کو اس عذاب سے بچالیا چنانچہ قرآن شریف میں اس مسرت کی خبر دی گئی ہے کہ جنتی یوں کہیں گے وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ یعنی فرحت ظاہر کریں گے کہ ہم کو خدا نے عذاب سے بچالیا اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ حشر میں کافر کو جنت دکھا کر کہا جاویگا کہ تیرا یہ ٹھکانا ہوتا اگر تو ایمان لے آتا اور مومن کو دوزخ دکھلا کر کہیں گے کہ تو ایمان کی بدولت اس سے بچ گیا ان سب امور

(۱) اس کا گواہ ہے (۲) تسلیم شدہ (۳) ذریعہ عذاب۔

سے اس دعویٰ کی تائید ہوگئی کہ دوزخ نعمت ہے گو خاص لوگوں کے واسطے یعنی فقط مومنوں کے واسطے ہے اور اس اعتبار خاص سے ہے بہرحال یہ ثابت ہوگیا کہ جہنم وغیرہ نقم کے بعد بھی فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ کا خطاب موزوں ہے۔

کلام اللہ کی خوبی

اب میں سابق کی طرف عود کرتا ہوں (۱) دراصل میں یہ بیان کررہا تھا کہ قرآن شریف میں ربط وترتیب بھی نہ ہوتی تب بھی کچھ حرج نہ تھا اس لئے ہم لزوم ترتیب کے قائل نہیں لیکن وقوع ترتیب کے قائل ہیں (۲) اور اس پر دلیل مجبور کرتی ہے کیونکہ نزول قرآن اور تلاوت قرآن کی ترتیب ایک نہیں ہے اگر نزول کے مطابق تلاوت ہوتی تو ہم وقوع کے بھی قائل اور مدعی نہ ہوتے گو کوئی نہ کوئی وجہ ربط کی اس وقت بھی نکل سکتی تھی مگر تکلف ہوتا اور یہ کمی کی بات ہے کہ تکلف سے قرآن شریف کی خوبیاں بیان کی جاویں، کیا اس میں واضح خوبیاں کم ہیں جو تکلف سے نکالیں قرآن اسکا محتاج نہیں ہے اسی واسطے صاحب کشاف نے کہا ہے کہ ایک ہی مضمون میں کہیں ''واؤ'' اور کہیں '' فا'' لانا تفنن عبارت ہے (۳) اور بعض نے کچھ کچھ نکات بیان کئے ہیں مگر ان نکات پر دلیل کوئی نہیں ہے اور بے دلیل نکات نکالنا گو تفسیر بالرائے کی فرد نہیں ہے مگر مشابہ ضرور ہے۔ اس لئے میرا وجدان پسند نہیں کرتا کہ اس کا دروازہ کھولا جاوے اور زمخشری کو تفسیر میں خاص دخل ہے اگر وہ معتزلی نہ ہوتے تو میں ان کو صاحب الہام کہتا مقطعات میں جو لطائف ونکات نکالے ہیں ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کہاں تک ذہن پہنچا ہے اور پچھلے سب لوگ مقطعات کے بیان میں اُن ہی کے تابع ہیں جب وہ اتنے بڑے شخص ہیں تو اُن کو ثم اور فا اور واو کا نکتہ بیان کرنا کیا مشکل ہے مگر انہوں نے تفنن کلام کہنے پر کفایت کی

(۱) اپنے ماقبل مضمون کی طرف لوٹتا ہوں (۲) آیات قرآنی میں ترتیب وربط لازم تو نہیں لیکن واقع ہے (۳) عبارت کی خوبی۔

اور تفنن کلام خود ایک مستقل خوبی ہے اس کے ہوتے ہوئے کسی بے دلیل خوبی کی حاجت نہیں ہے۔

ایک مضمون کو مختلف عنوانات سے بیان کرنے کا فائدہ

مدرسین خیال کرلیں کہ درس کے وقت اگر دوبار تقریر کرنا پڑے تو پہلی اور دوسری بار کی تقریر کے عنوان میں قصداً فرق کیا جاتا ہے وہاں سوائے تفنن کلام کے اور کچھ مقصود نہیں ہوتا۔ اور اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اگر ایک ہی تقریر ہو تو گویا آموختہ سا پڑھ دیا(۱) اگر مضمون پر قدرت ہے تو اسکی کیا ضرورت کہ وہی پہلے الفاظ ہوں۔ اور دوسری وجہ یہ کہ تکریر تقریر سے فائدہ یہ ہے کہ مضمون ذہن نشین ہوجاتا ہے سامعین کے۔ اور یہ جب ہی ہوتا ہے کہ طرز بدلا جاوے اور تقریر اول کو بعینہ دہرا دینے سے یہ نفع نہیں ہوتا۔ جیسا کہ تجربہ شاہد ہے نیز حق تعالیٰ فرماتے ہیں ہیں: ﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ﴾ (۲) یعنی ہم نے اس قرآن میں ایک مضمون کو طرح طرح سے بیان کیا ہے اور اس کی حکمت یہ منفعت بیان فرمائی ﴿لِیَذَّكَّرُوْا﴾ تاکہ اچھی طرح سے سمجھ لیں اور اس کے بعد شکایت فرماتے ہیں ﴿وَمَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا﴾ یعنی ان کو نفرت ہی بڑھتی جاتی ہے۔ پس اس سے معلوم ہوگیا کہ تکرار سبب ہے ذہن نشین ہونے کا چنانچہ مشہور جملہ ہے اذا تکرر الکلام علی السمع تقرر فی القلب (۳)۔ حاصل یہ کہ نزول اور تلاوت کی ترتیب اگر ایک ہوتی تو اس وقت وقوع ترتیب اور ربط بین الآیات والسور کے ہم قائل نہ ہوتے جیسا کہ احادیث میں قائل نہیں ہیں اور یہ بات میں نے اہل علم کے کام کی بتلائی ہے کیونکہ وہ حدیث کے جملوں میں ربط ڈھونڈا کرتے ہیں حالانکہ ان میں نہ ربط کی حاجت ہے نہ ہر جگہ ربط کا وجود ہے بلکہ واقعہ یوں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مثلاً چار

(۱) رٹی رٹائی بات دہرادی (۲) الاسراء: ۱۷/۴۱ (۳) جب کانوں میں کوئی بات بار بار پڑتی ہے دل میں جم جاتی ہے۔

باتوں کی نصیحت کرنا چاہا بس ان چاروں کو بیان فرمادیا اس میں ترتیب اور ربط کی کیا حاجت ہے۔ تکلف نہ کیا کرو طلبہ کو یہی جواب دیدیا کرو کہ یہ الگ الگ جملے ہیں ایک دوسرے سے مربوط نہیں اور گو اس جواب سے طلبہ خوش نہ ہوں گے مگر محقق تو ہوجائیں گے۔ لوگ ایسی باتوں کی قدر نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ تحقیق سے جواب نہیں دیا یوں ہی ٹالدیا ہے یہ خبر نہیں کہ قعر تک (۱) پہنچ کر لوٹے یہ نہ سمجھو کہ وہ محقق نہیں وہ ساری مسافت کو دو مرتبہ طے کر چکے ہیں آتے میں اور جاتے میں اور ان کی نظر واقع میں بہت عمیق ہے مگر جس طرز پر تم تقریر اور تحقیق چاہتے ہو وہ اس میں بھی کامل ہیں مگر وہ قصداً اُس طرز کو اس واسطے اختیار نہیں کرتے ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رندان خبرے نیست کہ نیست (۲)

بس حدیث میں سوال عن الترتیب کا جواب یہ ہے کہ کچھ ترتیب نہیں۔

ترتیب تلاوت وترتیب سور

اور قرآن شریف کی ترتیب نزول اور ترتیب تلاوت چونکہ جدا گانہ ہے وہاں جواب یہ ہے کہ کچھ ربط ومناسبت ضرور ہے گو ہم کو معلوم نہ ہو اور یہ ترتیبِ تلاوت، توقیفی ہے (۳) کیونکہ حضرت جبرئیل تصریحاً فرمادیا کرتے تھے کہ اس آیت کو فلاں جگہ رکھدیجئے بس یہ ترتیب توقیفی ہوئی۔ البتہ ترتیب سور میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ توقیفی ہے بعض کہتے ہیں اجتہادی ہے اور میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ اجتہادی ہے لیکن ہے قطعی بوجہ اجماع کے اس لیے اسکا خلاف جائز نہیں (۴) فقط ایک صورت مستثنیٰ ہے اور وہ بھی بالاجماع کہ بچوں کو عـــم پارہ پڑھنے میں ترتیب کے بدلنے کی فقہاء نے اجازت دیدی ہے تاکہ چھوٹی چھوٹی سورتیں پہلے

(۱) تہہ تک پہنچ کر (۲) راز سے پردہ اٹھانے میں مصلحت نہیں ہے ایسا نہیں ہے کہ ہماری راز تک رسائی نہیں ہے (۳) ترتیب تلاوت جبرئیل کے حکم سے اللہ کی طرف سے ہے (۴) سورتوں کی ترتیب اجتہادی ہے لیکن اس کے خلاف قرآن لکھنا جائز نہیں ہے۔

پڑھنے میں سہولت ہو اس کے سوا اور کسی جگہ اس ترتیب کی مخالفت جائز نہیں کیونکہ اجماع کی مخالفت ممنوع ہے مگر کسی نص سے یہ ترتیب بین السور تو قیفی نہیں ہے البتہ آیات کی ترتیب منصوص ہے اب میں کہتا ہوں کہ یہ فعل عبث تو ہے نہیں کہ ایک آیت نازل تو ہوئی کسی آیت کے بعد اور تلاوت کا حکم کیا گیا دوسری آیت کے بعد بس اس سے یہی معلوم ہوا کہ اس آیت سے اس کا تعلق زیادہ ہے اور گو احتمال اور بھی ہوسکتے ہیں مگر یہ زیادہ ظاہر ہے کہ زیادتی تعلق کی وجہ سے تلاوت کی ترتیب بدل گئی ہے یہ ہے وہ وجہ جس کے سبب آیات قرآن میں ربط کے قائل ہوئے ہیں باقی مسوق لہ الکلام (۱) کی تعیین کا کہیں تو آیت کے سیاق وسباق میں غور کرنے سے معلوم ہوجاتا ہے اور کہیں ذوق صحیح سے۔

عمل صالح کا فائدہ

اور ذوق پیدا ہوتا ہے اخلاص کے ساتھ عمل کرنے سے اخلاص اور عمل صالح ہی کی برکت سے محقق ہوجاتا ہے اسی کو کہا ہے ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب وبے معید واوستا(۲)

اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو عمل کرتا ہے اپنے علم پر اللہ تعالیٰ اس کو وہ چیز سکھاتا ہے جس سے کہ وہ ناواقف ہے جیسا کہ قرآن شریف میں ہے: ﴿ وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴾ (۳) یعنی ہم نے اس کو اپنے پاس سے علم دیا البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ انبیاء کے علوم قطعی ہوتے ہیں اور اولیاء کے علوم ظنی مگر ان ظنی علوم سے بھی ایسی تسلی ہوجاتی ہے کہ جانب مخالف کی طرف ذہن ہی نہیں جاتا ہاں تشکیک مشکک (۴) سے زائل ہوجاوے تو اور بات ہے۔

(۱) اس جگہ اس بات کو ذکر کرنے کی وجہ (۲) ''اپنے اندر بغیر کتاب ومعاون اور استاد کے انبیاء علیہم السلام جیسے علوم دیکھو گے'' (۳) سورۃ الکہف: ۶۵ (۴) کسی شک ڈالنے والے کی وجہ سے زائل ہوجائے تو اور بات ہے۔

انسان کی شکایت

اب میں تلاوت کردہ آیات میں تعیین کرتا ہوں مسوق لہ الکلام کی اور وہی مقصود بالبیان ہے اور وہ صرف ایک چیز ہے یعنی انسان کی شکایت ہے کہ وہ سنگدل ہے نہ نعم سے متاثر ہوتا ہے نہ نقم سے نہ مصیبتوں سے عبرت حاصل کرتا ہے نہ سامان راحت سے گرویدہ ہوتا ہے۔ طبیعت کے رنگ مختلف ہیں بعض پر تو نعمتوں کا اثر ہوتا ہے اور بعض پر تکالیف سے اثر ہوتا ہے جیسا کہ بعض نوکر انعام وغیرہ کی وجہ سے خوب خدمت کرتے ہیں اور سزا دینے سے چڑ جاتے ہیں اور بعض ملازمین جوتوں ہی سے سیدھے ہوتے ہیں اگر ان کو سزا نہ ملے تو دلیر ہو جاتے ہیں۔ ان دو کے سوا اور کوئی چیز موثر عادی نہیں (۱) اگر کسی طبیعت میں کسی طریق سے بھی اثر نہ ہو تو اس میں قساوت ہے (۲) کہ اثر ہی نہیں ہوتا اسی کی شکایت اس سورت میں کی گئی ہے مگر اثر سے مراد عقلی اثر ہے طبعی نہیں بس قساوت جب کہلاویگی کہ عقلی اثر بھی نہ ہو فقط طبعی اثر کے فقدان پر قساوت کا حکم لگانا صحیح نہیں ہے خوب سمجھ لو۔ اس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت لوگ غلطی میں پڑ جاتے ہیں بعض لوگ میرے پاس خط لکھتے ہیں کہ قلب میں قساوت ہے اور جب میں اُن سے قساوت کی تفسیر پوچھتا ہوں تو جواب میں لکھتے ہیں کہ عبادت میں مزہ نہیں آتا پس مزہ نہ آنے کو وہ قساوت سمجھ بیٹھتے ہیں اور خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں اور اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ مدارس میں کوئی ایسی کتاب داخل درس نہیں جس میں فن کے اصطلاحی کلمات کی تفسیر اور تعریف ہو کسی درسی کتاب میں عجب (۳) کی تعریف نہیں، ریا (۴) کی تعریف نہیں اور تفسیر معلوم نہ ہونے سے دو غلطیاں ہوتی ہیں ایک یہ کہ مرض موجود ہوتا ہے اور اپنے آپ کو مریض نہیں سمجھتے دوسرے اس کا عکس یعنی باوجود تندرست ہونے کے اپنے کو

(۱) عادتاً ان دو باتوں سے آدمی متاثر ہوتا ہے انعام اور ڈانٹ ڈپٹ (۲) اس کا دل سخت ہے (۳) تکبر (۴) دکھاوا۔

مریض خیال کرتے رہتے ہیں جیسا کہ امراض جسمانی میں ہوتا ہے کہ ناواقف آدمی بعض دفعہ تو بدون(۱) بخار کہہ دیتا ہے کہ بخار ہے اور بعض دفعہ بخار ہوتا ہے مگر یہی سمجھا جاتا ہے کہ بخار نہیں ہے یہاں تک کہ دِق ہوجاتی ہے اور دَق کرتی ہے(۲)۔ اس لاعلمی کی وجہ سے بہت لوگ ایسے ہیں کہ اُن کے مرض کی تشخیص کی جاتی ہے تو وہ مخالفت کرتے ہیں جیسا کہ میں نے ایک شخص کے متعلق تشخیص کیا کہ تم میں کبر ہے اُن کو برا معلوم ہوا پھر پانچ برس کے بعد اقرار کیا۔

طریقت کی حقیقت

اور اصل وجہ اس کوتاہی کی یہ ہے کہ واقع میں تو طریقت نام ہے مجموعہ اعمال ظاہر و باطن کی اصلاح و تکمیل کا مگر اب طریقت نام رہ گیا ہے فقط وظائف و کیفیات کا حالانکہ کیفیات کا تو مقصود میں دخل ہی نہیں چہ جائیکہ وہ خود مقصود ہو۔ بترتب غیر لازمی مرتب ہیں اور وظائف کا درجہ عرق بادیاں(۳) جیسا ہے اور اعمال کا درجہ مسہل(۴) جیسا ہے یعنی جس طرح اخراج مادہ کے لئے مسہل کی (۵) ضرورت ہے اور عرق بادیاں اس کی اعانت کرتا ہے(۶) اسی طرح رذائل کا مادہ زائل کرنے کے لئے(۷) اصلاح اعمال و مجاہدہ کی ضرورت ہے بغیر اس کے کام نہیں چلتا محض ذکر سے اصلاح نہیں ہوتی ہاں ذکر سے امداد ہوتی ہے(۸) کہ اُس پر رحمت ہوتی ہے اور سہولت ہوجاتی ہے نیز اعمال میں امتحان ہے ہماری طلب کا، اور بلا طلب فضل فرمانے کی نسبت ارشاد فرمایا ہے: ﴿اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ﴾(۹) کیا تم ہدایت سے نفرت کرتے ہو اور ہم اُس کو تمہارے ساتھ چپکا دیں۔ اجی وہ تو طلب کے بعد بھی عنایت فرمادیں تو محض ان کی رحمت ہے۔

(۱) بغیر بخار کے (۲) پریشان کرتی ہے (۳) عرق سونف (۴) دست آور دوا کی مانند ہے (۵) فاسد مادہ نکالنے کے لئے دست آور دوا دینے کی ضرورت ہوتی ہے (۶) اس کے لئے معاون ہے (۷) برائی کا مادہ ختم کرنے کے لئے (۸) مدد ملتی ہے (۹) سورۂ ھود: ۱۱/ ۲۸۔

کیا تم نے حق تعالیٰ کو ایسا قرار دیا ہے کہ جیسے کسی کا کوئی خریدار نہ ہو اور وہ خواہ مخواہ لپٹتا پھرے۔ غرض ہم کو طلب کرنا لازم ہے اس لئے اعمال کی پابندی کرنا ضرور ہے تا کہ طلب ظاہر ہو اور اب تو آرام طلبی چاہتے ہیں اور ذکر بہ نسبت اعمال کے آسان ہے اس کو کر لیتے ہیں مگر اعمال میں دقت ہوتی ہے اس لئے اُس سے جان چھڑاتے ہیں مگر حقیقت میں طلب ضروری چیز ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ اصلاح اعمال میں کوشش کی جاوے مگر اب اعمال کی طرف توجہ نہیں نہ باطن کی اصلاح نہ ظاہر کی اور اعمال ظاہرہ کے احکام تو کچھ معلوم کر بھی لیتے ہیں مگر اصلاح باطن کے مسائل تک بھی نہیں معلوم کرتے۔ تا بہ عمل چہ رسد(۱) اگر کسی نے اس حالت کو دیکھ کر کہہ دیا

در کنز وہدایہ نتواں یافت خدا را (۲)

تو اس نے کیا ظلم کیا اس کی مراد یہ ہے کہ نتواں یافت بعض احکام خدا را(۳) اور یہ بالکل سچ ہے اور اعمال کے متعلق ایک اور بات بھی قابل غور ہے وہ یہ کہ تصوف کی کتابوں میں معالجات نفس دیکھ کر ان پر عمل کر لینا کافی نہیں ہے کیونکہ یہ فن علم و عمل دونوں سے مرکب ہے نہ فقط جاننے سے کچھ ہوتا ہے اور نہ بطور خود کرنے سے بلکہ مشق کی سخت ضرورت ہے اس لئے علم و عمل کے ساتھ صحبت اہل طریق بھی لازم ہے۔

صحبت اہل طریق کی ضرورت

اور اہل طریق سے وہ مراد ہے جو علم کے ساتھ عمل کرنے والا بھی ہو اور جو محض علم رکھتا ہو وہ درحقیقت اس فہرست میں داخل نہیں ہے بس طالب اصلاح کو عالم باعمل کی خدمت میں رہنا ضروری ہے ورنہ ایسا ہوگا جیسا کہ ایک عورت گلگلے پکا رہی تھی اس کے میاں کو کسی چیز کی ضرورت ہوئی جو اندر رکھی تھی۔ میاں نے اُس

(۱) پھر عمل کرنے پر کب آمادہ ہوں گے (۲) کتاب کنز الدقائق اور ہدایہ پڑھ کر آدمی خدا کو نہیں پا سکتا جب تک ان احکامات پر عمل پیرا نہ ہو (۳) اس کی مراد یہ ہے کہ ان کتابوں کی تعلیم سے بعض احکام سے واقف نہیں ہو سکتا یعنی احکام تصوف۔

سے فرمائش کی کہ تلاش کر کے لادو اُس نے مشغولی کا عذر کیا وہ بولا تم لے آؤ، گلگلے میں پکالوں گا وہ ان کو کڑاہی سپرد کر کے اندر چلی گئی آپ نے کھڑے کھڑے کڑاہی میں آٹا چھوڑ دیا چونکہ دور سے چھوڑا گیا چھینٹوں سے ہاتھ منہ پھونک لیا(۱)۔ کیا رسالہ خوان نعمت(۲) میں یہ بات بھی لکھی جاتی کہ اس ہیئت سے بیٹھ کر آٹا چھوڑیں۔ یہ بات تو استاد ہی سے حاصل ہونے کی ہے لکھنے سے سمجھ میں نہیں آسکتی پس اسی طرح ضرورت ہے کہ اصلاح باطن کے لئے کسی فن داں کے پاس رہے۔ بدون(۳) اس کے صدہا غلطیوں میں ابتلاء ہوجاتا ہے۔

قساوت کی حقیقت

چنانچہ قساوت ہی کی حقیقت میں وہ غلطی ہوئی جو مذکور ہوئی جس کا حاصل یہ ہے کہ قساوت اصطلاحی لفظ ہے اور وہ اصطلاح ہر وقت متحضر نہیں(۴) رہتی ایسے نکتے صحبت سے حاصل ہوتے ہیں اس عدم استحضار سے خود اس کی یہ تفسیر کر لیتے ہیں کہ مزہ نہیں آتا حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ مزہ غیر اختیاری ہے اور قساوت پر وعید آئی ہے اور غیر اختیاری سے وعید متعلق نہیں ہوسکتی کہ اس میں تکلیف مالا یطاق ہے جو خلاف ہے ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾(۵) کے پس ثابت ہوا کہ قساوت اور شئی ہے اور مزہ نہ آنا اور شئی ہے دراصل قساوت عدم تاثر قلب کا نام ہے(۶) اور اثر بھی وہ جس کا پیدا کرنا اس کے اختیار میں ہے اور اس قساوت پر وعید آئی ہے اس لئے اس کو دور کرنا ضروری ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ابعد الشیء من اللّٰہ القلب القاسی یعنی سب چیزوں میں خدا سے زیادہ دور قلب قاسی ہے قرآن شریف میں ہے: ﴿فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾(۷) یعنی ہلاکی ہے ان کے لئے جن کے دل خدا تعالیٰ کی یاد سے سخت ہیں۔

(۱) گرم تیل کی چھینٹوں سے ہاتھ منہ جل گیا (۲) وہ کتاب جس میں کھانے پکانے کی تراکیب درج ہوں (۳) اس کے بغیر سینکڑوں غلطیوں میں مبتلا ہوگا (۴) ذہن میں حاضر نہیں ہوتی (۵) البقرہ:۲/۲۸۶ (۶) دل کے متاثر نہ ہونے کا نام ہے (۷) الزمر:۳۹/۲۲۔

نرم دلی کی حقیقت

خلاصہ یہ ہوا کہ قساوت مقابل ہے لین کے(۱) اور لین کے دو درجے ہیں ایک عقلی، یہ اختیاری ہے، اور یہی مورد بہ ہے(۲) اس میں خلل بھی اختیار سے آتا ہے اسی واسطے اس پر مواخذہ ہے اور دوسرا درجہ طبعی ہے اور اس میں کبھی اختلاف فطرت سے کبھی قلت وکثرت مزاوَلت (۳) سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اور درجہ عقلی کی تدبیر تفکر ہے (۴) اور گو تفکر کے بعد اثر ہونا اور لین پیدا ہونا اختیاری نہیں ہے مگر حق تعالیٰ شانہ کی عادت ہے کہ اس کے بعد پیدا کر ہی دیتے ہیں پس یہ درجہ لین کا اختیاری اس معنی کر ہوا کہ اسکا سبب اختیاری ہے جیسا کہ بصر کو اختیاری کہتے ہیں حالانکہ براہ راست اختیاری نہیں کیونکہ آنکھ کھولنے کے بعد نہ دیکھنا اختیار میں کہاں ہے اور اختیاری وہی ہے کہ جسکا کرنا نہ کرنا دونوں قدرت میں ہوں اس سے معلوم ہوا کہ آنکھ کھولنا تو اختیاری ہے اور دیکھنا غیر اختیاری مگر چونکہ آنکھ کھولنے کے بعد دیکھنا لازم ہے اس لئے دیکھنے کو اختیاری کہا جاتا ہے بس اسی طرح لین بھی اپنی ذات میں غیر اختیاری ہے مگر اُس کا سبب یعنی تفکر اختیاری ہے اور اس تفکر پر وہ ہمیشہ مرتب ہوجاتی ہے اس واسطے لین کو اختیاری کہا جاویگا خوب سمجھ لو۔ اور اس پر ایک تفریع بھی کرتا ہوں وہ یہ کہ کوئی مسلمان اپنے متعلق قساوت کا گمان نہ کرے کیونکہ کوئی مسلمان ایسا نہیں جو وعید سن کر فکر نہ کرے اور اُس کے قلب میں مواخذہ اُخروی کا کھٹکا نہ پیدا ہوجاوے گو ضعیف ہی ہو مگر ہوتا ہے ہر مسلمان کو ضرور۔ اور اگر کوئی شخص ایسا ہو کہ اُس کے دل میں معصیت (۵) کر کے اور وعید سن کر اندیشہ بھی پیدا نہیں ہوتا تو وہ اپنا علاج کرے اول تو اُس کا مسلمان ہونا ہی مشکل ہے مگر میں اس سے بحث نہیں کرتا فقط علاج کے لئے کہتا ہوں اگر خدانخواستہ اس درجہ کو

(۱) نرمی (۲) اور اسی کے بارے میں یہ حکم ہے (۳) معمول کی کمی زیادتی (۴) درجہ عقلی کے حاصل کرنے کی تدبیر اور فکر ہے (۵) گناہ کر کے۔

مرض پہنچ گیا ہے کہ ایمان بھی باقی نہ رہا تو اس کے علاج کا ایک جزو تجدید ایمان بھی ہے اس لئے میں عام لفظ کے ساتھ کہتا ہوں کہ علاج کرے۔ غرض یہ کہ لین اختیاری سب مسلمانوں میں ہے ہاں کلی مشکک ہے کسی میں کم کسی میں زیادہ اور کمی قابل شکایت بھی ہے لیکن صرف کمی ہی کی شکایت کی جاوے مطلقاً نفی نہ کی جاوے مثلاً کسی نے شرح ملا تک (۱) پڑھا ہے وہ یوں کیوں کہے کہ میں نے عربی نہیں پڑھی یوں کہے کہ تکمیل نہیں کی۔ اگر کوئی مسلمان لین کا بالکل انکار کرے وہ ناشکرا ہے کہ خدا نے اس کو ایک نعمت عطا فرمائی ہے اور وہ اس کا اعتراف نہیں کرتا۔

حکایت

ناشکرے پر ایک حکایت یاد آئی الٰہ آباد میں ایک بزرگ ولایتی تھے اُن کے ذکر کی تمام شہر میں آواز جاتی تھی اکثر حضرات مقدمہ کے لئے دعا کرانے کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ بزرگ مختلف ہوتے ہیں بعض تعویذ گنڈوں کے واسطے ہوتے ہیں بعض دعا کے واسطے ہوتے ہیں اور بعض بزرگ بھی نہیں اور اپریشن کرتے ہیں چنانچہ الحمدللہ میں بھی اُن میں ہوں ۔

نسازد عشق را کنج سلامت خوشا رسوائی کوے ملامت(۲)
گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں ما نمیخواہیم ننگ ونام را(۳)

بدنام ہونے میں بھی مصلحت ہے کہ کسی کو دھوکا نہیں ہوتا بخلاف اس کے عکس کے اگر کوئی اچھا سمجھ کر آوے اور خلاف پاوے تو برا ہے خیر یہ قسم تو بزرگوں سے الگ ہے مگر خود بزرگوں کی بھی مختلف قسمیں ہیں۔ بہرحال اُن ولایتی بزرگ کو لوگوں نے دعا کے واسطے منتخب کر رکھا تھا میں نے بھی والد صاحب کے ہمراہ ان کی زیارت کی ہے اس وقت میری عمر بیس سال کی ہوگی کتابیں ختم ہوچکی تھیں۔ یہ تو

(۱) کتاب کا نام ہے (۲) عشق کے لئے کوچہ سلامتی کی ضرورت نہیں اس کے لئے تو ملامت کا کوچہ ہی پسندیدہ ہے
(۳) انسان پر تہمت لگانا اگرچہ عقلاء کے نزدیک باعث بدنامی ہے لیکن نام ونمود کی خواہش ہی نہیں۔

اپنی ملاقات کا تذکرہ درمیان میں سنا دیا اصل میں ان کا قصہ سنانا مقصود ہے کہ حافظ عبدالرحمٰن بگہرے کے رہنے والے ایک نیک آدمی تھے وہ اُن بزرگ کے ہاں گئے ایک اور شخص بھی حافظ صاحب کے ہمراہ تھا اُن سے پوچھا یہ کون ہیں انہوں نے بتلادیا کہ حافظ ہیں اس پر حافظ صاحب نے ازراہ تواضع کہا کہ میں تو کچھ بھی نہیں بس وہ بزرگ خفا ہوگئے اور فرمایا اوناشکرا تو چاہتا ہے کہ قرآن شریف تم سے چھین لیا جائے پھر حافظ صاحب بڑے چپ ہوئے اور جب حافظ جی وہاں جاتے تو وہ ناشکرا کہہ کر پکارا کرتے۔ میں کہتا ہوں کہ شرح ملا تک پڑھ کر کیوں کہے کہ میں جاہل ہوں یہ تو ایسا ہے کہ کوئی اپنے کو گدھا کہنے لگے واہ صاحب اچھی تواضع ہوئی۔ بس خدا نے جس کو خشوع کی نعمت عطا فرمائی ہے وہ اُس کا انکار کرکے ناشکرا نہ بنے مگر تکمیل کی تدبیر کرے۔

کفار کو خطاب

پس جب معلوم ہوگیا کہ کسی مسلمان میں قساوت (۱) نہیں ہے اور یہاں قساوت کی شکایت ہے تو اس سے معلوم ہوگیا کہ یہ آیات کافر کی شان میں ہیں چنانچہ اس جگہ اور نیز دوسرے مواقع پر مفسرین تفسیر میں الکافر الکافر لکھتے ہیں اور اس کا قرینہ خود قرآن شریف میں ہے ارشاد فرمایا ہے: ﴿فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ۙ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ﴾ (۲) اور ظاہر ہے کہ یہ مومن کی شان نہیں ہوسکتی بس معلوم ہوا کہ ایسی شکایات کفار کے متعلق ہیں۔

(۱) سخت دلی (۲) ''یعنی وہ لوگ جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خالص اعتقاد کرکے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں پھر جب اُن کو نجات دیکر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو وہ فوراً شرک کرنے لگتے ہیں'' العنکبوت:۲۹/۶۵،۶۶۔

مسلمانوں کو تنبیہ

مگر یہ سن کر بے فکر بھی نہ ہوجانا کیونکہ مسلمان ہونے کی وجہ سے اگر ان آیات کا مصداق نہیں رہے تو کیا ہوا ان پر ایک اور مقدمہ اُس سے بڑھ کر قائم ہوگیا وہ یہ کہ اگر مسلمان نہ ہوتے تو اس حالت پر اتنا افسوس نہ ہوتا کیونکہ حالت کفر میں یہ کیفیت ہونا بعید نہیں ہے اور اب ہیں تو مسلمان مگر حالت کفار کے مشابہ ہے جیسا چمار کا لگوٹی باندھنا کچھ بھی تعجب نہیں اور مسلمان شریف آدمی لنگوٹی باندھے تو بہت معیوب بات ہے اور اس مشابہت پر یہ سوال ہوگا کہ جب قادر تھے تو ازالہ کیوں نہیں کیا اور لین وخشوع (۱) کامل کیوں حاصل نہ کیا اور اس تقریر مشابہت سے حدیث من ترك الصلوٰة متعمدا فقد كفر (۲) کی حقیقت بھی معلوم ہوگئی کہ یہ ایک محاورہ ہے اور اس جگہ محاورہ ہی کو حَکَم بنایا جاویگا حقیقی معنی پر محمول نہ کیا جاویگا اگر کسی سید نے اپنے بیٹے کو کسی نامناسب کام کی وجہ سے چمار (۳) کہدیا تو کیا وہ سچ مچ چمار بن گیا کیا اس کی قومیت میں فرق آ گیا، نسب میں نقص آ گیا ہرگز نہیں اگر کوئی اسکو حقیقت پر محمول کرے اور جس گھر اُس سید زادہ کی منگنی ہوئی ہے وہاں جا کر کہدے کہ وہ لڑکا چمار ہے تم اپنی بیٹی اُس کو کیوں دیتے ہو اور دلیل میں خود اُس کے والد کا قول نقل کرے تو کیا لڑکی والا تسلیم کرلیگا اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کفر دون کفر اسی کو کہا ہے کہ محاورات میں کفر کہدیا جاتا ہے اور کفر حقیقی مراد نہیں جس طرح مشابہ چمار کو چمار کہدیا جاتا ہے اور یہ معنی بالکل بے غبار ہیں اب چاہے مشترک کہدیجئے چاہے مجاز۔ حقیقت ظاہر ہوگئی جس طرح چاہے تعبیر کردیجاوے غرض قساوت کا کوئی شائبہ بھی مسلمان میں ہونا بڑی بے غیرتی کی بات ہے گو شدت اُس میں زیادہ ہے مگر استنکار (۴) اِس میں زیادہ ہے اس سورت میں (۵) اس عدم تاثر کی شکایت ہے یہ خلاصہ تھا مقصود سورت کا۔ (۶)

(۱) نرمی اور کمال عاجزی کیوں نہ حاصل کی (۲) جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑی اس نے کفر کیا، المعجم الاوسط، جزء ۳، من اسم جعفر: رقم الحدیث: ۳۳۴۸ (۳) بھنگی (۴) برائی (۵) سورۃ البلد میں (۶) اس سورۃ میں جو مقصود ذکر کیا گیا یہ اسکا خلاصہ تھا۔

عنایات ربانی

اب ترجمہ کرتا ہوں ارشاد فرمایا ہے: لَآ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِ اس میں لا زائد ہے اور لا بڑھانے میں نکتہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ بات قسم کھانے کی تو ہے نہیں مگر تمہارے فہم کی رعایت سے کھائی جاتی ہے اور یہ علمی نکتہ ہے مگر اہل ذوق اس سے متاثر ہوتے ہیں ہمارا ذوق صحیح نہیں ہے ورنہ ہمارے بھی ہوش اُڑ جاتے اور اہل ذوق نے تو اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (۱)۔ کو سنکر بھی گردنیں جھکا دیں اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین سے جنت کے عوض میں اُن کی جانیں اور مال خرید لئے ہیں اس خوشی سے گردنیں جھکا دیں کہ خدا خریدار ہوگیا ہماری جان اور ہمارے مال کا اور واقعی ہے بھی یہ کتنی خوشی کی بات ؎

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را　　　کہ بیک گل میخری گلزار را(۲)

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد　　　آنچہ در وہمت نیاید آں دہد(۳)

اہل ذوق کا حال

اور یہ خوشی کی بات تو ہے ہی مگر بعض اہل ذوق پر ایک اور اثر ہوا کیونکہ اشتراء میں ایک چیز مشتری کی ملک ہوتی ہے اور ایک چیز بائع کی ملک ہوتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جان و مال حقیقت کے اعتبار سے سب خدا ہی کے ہیں ہماری ملک تو برائے نام مجازاً کہدی جاتی ہے۔ پس اہل ذوق کو لفظ اشتری سے یہ خیال ہوا کہ حقیقت کو چھوڑ کر جو حق تعالیٰ نے مجاز کی بناء پر اشتری فرمایا ہے اس کی یہ وجہ ہے کہ ہم جان و مال کو اپنا سمجھتے ہیں گویا اس دعوے کی طرف اشارہ ہے یعنی ہم چونکہ

(۱) سورۂ توبہ، الآیۃ: ۱۱۱ (۲) ''ان کا اپنا کیا حال ہوگا جبکہ ان کے بازار کی یہ کیفیت ہے کہ ایک پھول کے عوض پورا گلستان دیدیتے ہیں'' (۳) ''ایک جان لیکر سو جانیں عطاء کرتے ہیں، وہ کچھ عطاء کرتے ہیں کہ جس کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا''۔

اُن کو اپنا کہا کرتے ہیں اس واسطے حق تعالیٰ نے ان کو ہماری طرف منسوب فرمادیا اُن کو اِس سے اپنا دعویٰ یاد آکر ان کی گردنیں ندامت سے جھک گئیں اور ان ہی اہل ذوق نے یہ بھی کہا ہے کہ حدیث میں جو ایک جنت کو اور اس کے سامان کو سونے کا فرمایا ہے اور دوسری کو چاندی کا۔ یہ رنگ کا اختلاف اس واسطے ہے کہ ان اہل ندامت کو سونے کی جنت دی جاویگی کیونکہ ندامت سے رنگ زرد ہوجاتا ہے اور سونے کا رنگ بھی زرد ہے اور جو اس بشارت سے خوش ہوئے تھے اُن کو چاندی کی جنت دی جاویگی اور یہ ذوقی علم ہے۔

موقع قسم پر کلمہ ''لا'' لانے کا نکتہ

اسی طرح کا نکتہ لَآ اُقْسِمُ میں لا کے زائد ہونے کا ہے اور قسم قرآن شریف میں بہت جگہ ہے مگر کہیں لا ہے کہیں نہیں مثلاً والصآفات والعٰدیات والتین وغیرہ میں لا نہیں ہے۔ اور جہاں اقسم ہے وہاں لا ہے مثلاً لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ وغیرہ میں لا موجود ہے اور اس میں یہ نکتہ ہے۔

غلبہ حقیقت کے آثار

اور قسم کی مناسبت سے ایک قصہ یاد آگیا اصمعی رحمۃ اللہ علیہ راوی ہیں قصہ ایک بدوی کا ہے بعض طبائع سلیم ہوتی ہیں گاؤں یا شہر میں رہنے پر موقوف نہیں بلکہ آجکل تو اکثر درسیات میں مقید ہونے سے اصلی مذاق خراب ہوگیا ہے چاہئے تو یہ کہ سب علوم کو اپنے درجہ میں رکھے مگر اب سادگی نہیں رہی لفظی چکر میں پڑجاتے ہیں اور مشاہدہ ہے کہ علم اصول میں جو زیادہ غلو کریگا وہ تفقہ سے جاتا رہے گا۔ اور درسیات میں مقید نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس میں غلو نہ کرے یہ مطلب نہیں کہ اصول کا اتباع بھی نہ کرے یہ تو امر ضروری ہے۔ القصہ اصمعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ

ایک جمّال(۱) ہمارے ساتھ تھا میں تلاوت کرتے کرتے وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ پر پہنچا تو اس جمّال نے کہا مکرر پڑھو(۲) انہوں نے مکرر پڑھا جمّال نے سنتے ہی کہا کہ جب رزق آسمان میں ہے تو زمین میں کیوں تلاش کریں یہ کہہ کر چلدیا اور اونٹ بھی چھوڑ گیا مدتوں کے بعد ایک دن ان کو وہ جمّال طواف کعبہ میں ملا اور اُس نے پہچان لیا اور بڑا خوش ہوا مگر اصمعی نے نہیں پہچانا۔ دریافت کیا تو بتلادیا کہ میں وہی شخص ہوں جس کو تمہارے طفیل اس طرح ہدایت ہوگئی تھی ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی مرا باجانِ جاں ہمراز کردی(۳)

دعائیں دیں اور خوب ملے بعد ازاں کہا کہ اس وقت موقع نہ ہوا، اب مجھ کو سناؤ کہ اُس آیت کے آگے بھی کچھ ہے اصمعی رحمۃ اللہ علیہ نے فَوَرَبِّ السَّمَآءِ (۴) پڑھا۔ اُس نے کہا کہ اے اصمعی کسی ظالم نے خدا کی تکذیب کی ہوگی جو اُس نے اس مضمون پر قسم کھائی یہ کہہ کر ایک چیخ ماری اور اُسی وقت دم نکل گیا یہ ہوتے ہیں آثار غلبۂ حقیقت کے۔ طالب علم تو یہ کہہ کر فارغ ہوگیا کہ لا زائدہ ہے اور اسی پر نازاں ہیں کہ ہم محقق ہوگئے۔

علم حقیقی

صاحبو! آگے بڑھنا چاہئے کہ یہاں اس لا کو لایا کیوں گیا۔ جیسا میں نے ایک ذوقی نکتہ بیان کیا ہے جو خود مقصود نہیں مگر اُس سے جس چیز کی طرف اشارہ ہے وہ ضرور مقصود ہے خواہ بواسطہ اُس سے متاثر ہوجائے خواہ بلاواسطہ۔ اسی آگے بڑھنے کے متعلق کہا جاتا ہے ؎

(۱) اونٹ چلانے والا (۲) دوبارہ پڑھو (۳) اللہ تمہیں جزائے خیر دے تم نے میری آنکھیں کھولدیں اور مجھے میرے محبوب سے ملادیا (۴) الذاریات، الآیۃ: ۲۳۔

چند خوانی حکمت یونانیاں حکمت ایمانیاں راہم بخواں
علم چوں بردل زنے یارے بود علم چوں برتن زنے مارے بود
علم رسمی سر بسر قیل ست وقال نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال
علم چہ بود آنکہ رہ نمایدت زنگ گمراہی زدل بزدایدت
ایں ہو سہا از سرت بیروں کند خوف وخشیت دردلت افزوں کند
تو ندانی جز یجوز ولا یجوز خود ندانی کہ حوری یا عجوز(۱)

ایک اور صاحب کا قول ہے ؎

ایھا القوم الذی فی المدرسہ کل ما حصلتموہ وسوسہ (۲)
علم نبود غیر علم عاشقی ما بقی تلبیس ابلیس شقی (۳)

ہم لوگ الفاظ ہی کی تحقیق کرتے رہتے ہیں اور وہ حضرات معانی سے متاثر ہوتے ہیں اس تفاوت کی ایک اور مثال یاد آئی وہ یہ کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اخیر شب میں حق تعالیٰ آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتے ہیں۔ اہل الفاظ تو اس میں پڑ گئے کہ نزول کے معنی کیا ہیں۔ سلف نے تو بدون کھود کرید کئے ہوئے کہا تھا آمنا اور ہم چکر میں پڑ گئے اور اہل تحقیق کو سنتے ہی یہ خیال غالب ہوا ؎

امروز شاہ شاہاں مہماں شدہ است مارا جبریل با ملائک دربان شدہ است مارا(۴)

(۱) ''یونانی حکمت کی کتابیں کب تک پڑھتے رہوگے کچھ حکمت ایمانی یعنی معرفت کی تو پڑھو۔ علم جب قلب پر اثر کرے کہ خشیت اور خلوص پیدا ہوجائے تو وہ وصول الی اللہ میں معین ہوگا اور اگر تن پر اثر ہو یعنی زبان پر تقریر ہی ہو یا اس کو تن پروری کا ذریعہ بنایا تو تیرا بوجھ اور وبال ہے۔ ایسا رسمی علم جس سے کوئی کیفیت اور حالت تبدیل نہ ہو صرف قیل وقال کے درجہ میں ہوتا ہے اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ ایسا علم کس کام کا نہیں جو راہ نہ دکھائے جس سے دل کا زنگ دور نہ ہو۔ یہ صرف ہوس ہے اس کو اپنے دل سے باہر کر اللہ کا خوف اور اسکی خشیت اپنے دل میں پیدا کر۔ تو صرف جائز وناجائز کے علاہ کچھ نہیں جانتا تجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ کنواری ہے یا بڑھیا (۲) اے مدارس میں پڑھنے والو تم نے جو علم حاصل کئے ان کی حقیقت وساوس سے زیادہ کچھ نہیں (۳) ''رب کریم کی عاشقی کے علم کے علاوہ کوئی علم علم ہی نہیں اس کے علاوہ تو سب ابلیس بدبخت کی تلبیس ہے'' (۴) آج احکم الحاکمین میرے مہمان ہوئے ہیں جبرئیل علیہ السلام فرشتوں سمیت میری دربانی کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

اور اس خیال سے کیا عمل پیدا ہوا۔ نیند اڑ گئی اس فکر میں کہ کہیں وہ مبارک وقت ہاتھ سے نہ جاتا رہے جس کو عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے بہ از آنکہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے (۱)

عبادت کا بہترین وقت

بڑے مزے کا وقت ہے فراغ کیسا ہوتا ہے (۲) کہ کوئی دھندا نہیں ہوتا۔ حق تعالیٰ نے حضور کو قیام لیل کا جو امر فرمایا ہے (۳) اور اس کے بعد بھی ارشاد فرمایا ہے اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا (۴) یعنی دن میں آپکو بہت کام ہوتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (۵) یعنی جب (دوسرے مشاغل سے) فراغت ہوا کرے تو محنت کیا کیجئے۔ ان دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ پوری فراغت کا تحقق رات کو ہوتا ہے ؎

چہ خوش وقتے وخرم روزگارے کہ یارے برخوردار از وصل یارے (۶)

البتہ جس کے سر میں سحر (۷) کو اُٹھنے سے درد ہو جاتا ہو وہ معذور ہے اس کو عشاء کے بعد نوافل پڑھنے سے فضیلت حاصل ہو جاتی ہے اور جس کو کوئی عذر نہ ہو وہ اٹھے اور اُس وقت کی حلاوت (۸) حاصل کرے۔

عشّاق کا حال

الحاصل اہل ذوق کو یہ پیش نظر ہو گیا کہ اس وقت ہم کو کیا کرنا چاہئے جیسا کہ بادشاہ کی آمد کا خواستگار (۹) جب سنے کہ بادشاہ آرہا ہے تو وہ اگر واقعی خواستگار ہے تو بادشاہ کے لئے سامان کریگا اور بے حس اسی گفتگو میں رہ جائیگا کہ فلاں فلاں وجوہ سے بادشاہ کا آنا مستبعد ہے (۱۰) مگر عاشق اس استبعاد کی فکر میں نہیں پڑتا اگر اس فکر

(۱) ''اللہ کے ساتھ ایک لمحہ کے اطمینان سے توجہ میسر آنا بادشاہی ملنے سے بہتر ہے'' (۲) اس وقت آدمی بالکل فارغ ہوتا ہے کہ کوئی کام نہیں ہوتا (۳) حکم دیا (۴) المزمل: ۷ (۵) الانشراح: ۷ (۶) ''وہ کیا اچھا وقت اور اچھا زمانہ ہے کہ جس میں کوئی محبّ اپنے محبوب کے وصل سے متمتع ہو'' (۷) صبح کو اٹھنے سے (۸) مٹھاس (۹) بادشاہ کے آنے کی تمنا رکھنے والا (۱۰) بادشاہ کا آنا بعید ہے۔

میں پڑے تو وہ عاشق نہیں بلکہ بوالہوس ہے(۱) اس فرق کے متعلق ایک واقعہ یاد آ گیا کسی کا شعر ہے

تیرے کوچہ سے جب اُٹھ اہل وفا جاتے ہیں تا نظر کام کرے رو بقضا جاتے ہیں

ایک شخص نے اس کا خوب رد کیا۔

تیرے کوچہ سے کب اٹھ اہلِ وفا جاتے ہیں وہ ہوسناک ہیں جو رو بقضا جاتے ہیں

عاشق کے سامنے یہ سب احتمالات رفو چکر ہو جاتے ہیں ؎

عشق آں شعلہ ست کو چوں برفروخت ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

تیغ لادر قتل غیر حق براند در نگر آخر کہ بعد لاچہ ماند

ماند الا اللہ وباقی جملہ رفت مرحبا اے عشق شرکت سوز زفت(۲)

اسکو تو اپنے کام ہی سے فرصت بھی نہیں احتمالات کس وقت سوچے۔

ایک نحوی کا حال

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک نحوی کشتی میں سوار تھا ملاح(۳) سے پوچھا کہ کچھ نحو بھی پڑھی ہے اُس نے کہا نہیں نحوی صاحب بولے، تو نے آدھی عمر ضائع کی اتفاق سے کشتی بھنور میں پڑ گئی ملاح نے کہا مولانا کچھ تیرنا سیکھا ہے۔ جواب دیا نہیں ملاح نے کہا کہ آپ نے اپنی عمر ساری ضائع کی اس پر مولانا فرماتے ہیں ؎

محوی باید بہ نحو اینجا بداں گر تو محوی بے خطر در آب راں (۴)

یعنی یہاں محو چاہیئے نحو کی ضرورت نہیں۔

---

(۱) بندہ ہوس (۲) عشق وہ شعلہ ہے کہ جب روشن ہوتا ہے تو معشوق کے سوا سب کو جلا کر خاک کر دیتا ہے لا الہ الا اللہ پڑھتے وقت ''لا'' کی تلوار سے حق کے علاوہ سب کو قتل کرو پھر دیکھو کے لا کے بعد کیا بچا صرف الا اللہ یعنی اللہ رہ جائے گا باقی سب تمہارے دل سے نکل جائیں گے مبارک ہو اے عشق کہ تیری وجہ سے شرک سے محفوظ رہا (۳) کشتی چلانے والا (۴) ''اس موقع پر تو تیراکی سے واقف ہونا ضروری ہے علم نحو کی واقفیت کس کام کی اگر تم تیراک ہو تو بے خوف وخطر پانی میں کود جاؤ''۔

منطقیوں کی حکایات

ایسے ہی ایک معقولی غالی تھے(۱) حالانکہ ضرورت ہے عالی بلکہ حالی ہونے کی(۲) وہ معقولی صاحب ایک تیلی(۳) کے یہاں تیل لینے گئے۔ دیکھا کہ بیل کے گلے میں گھنٹی بندھی ہوئی ہے آپ نے تیلی سے اسکا سبب دریافت کیا تو تیلی نے کہا کہ ہم غریب آدمی ہیں بہت سے کاموں میں لگے رہتے ہیں بیل کی نگرانی نہیں کرسکتے اس کی آواز سے معلوم ہوجاتا ہے کہ چل رہا ہے آواز نہ آوے تو ہم کو اطلاع ہوجاتی ہے کہ کھڑا ہوگیا ہے جاکر ہانک دیتے ہیں معقولی صاحب بولے کہ اگر بیل کھڑا ہوکر سر ہلاتا رہے گھنٹی تو جب بھی بجتی رہے گی پھر کیسے معلوم ہوگا کہ کھڑا ہے یا چل رہا ہے تیلی نے کہا ہمارے بیل نے منطق نہیں پڑھی آپ تشریف لے جایئے کبھی منطقی احتمال سن کر یہ نہ بگڑ جاوے۔

ایک اور خبطی(۴) تھا معقولات سے فارغ ہوکر اپنے گھر گیا باپ کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھا باپ غریب تھا مگر دو انڈے پکوائے ان کو دیکھ کر کہا ابا ہم ایسا علم پڑھ کر آئے ہیں کہ دو انڈوں کو سو بنادیں۔ واہ واہ صاحبزادے انڈے دیتے آئے ہیں۔ ابا نے کہا کیسے اس نے کہا دو تو یہ اور ایک انکا مجموعہ تین ہوئے پھر تین یہ اور ایک ان کا مجموعہ ملکر چار ہوئے اسی طرح سو(۱۰۰) تک پہنچادیا اور کہا ھلم جرًّا الی مالا یتناھی (۵)مقولہ مشہور ہے لولا الا عتبارات لبطل الحکمۃ (۶) مگر بعض اعتبارات ایسے ہیں کہ ان کی بابت لولا الاعتبارات لبطل الحماقۃ (۷) صادق ہے۔ بڈھا تھا عقلمند، آخر اس کا باوا ہی تو تھا اس نے کیا کیا کہ ایک انڈا تو اٹھا کر خود کھالیا اور دوسرا اٹھا کر چھوٹے بیٹے کو دیدیا اور اُن معقولی

(۱)علم معقول میں غلو کی حد تک مشغول تھے (۲) حالانکہ ضرورت علم عالیہ قرآن وحدیث کے جاننے کی ہے بلکہ اس علم کی ہے جو انسان کا حال بن جائے (۳) تیل نکالنے اور بیچنے والا (۴) بے وقوف (۵) اسی طرح لامتناہی حد تک (۶) اگر علم اعتبار نہ ہوتا تو علم منطق ختم ہوجاتا (۷) اگر علم اعتبار نہ ہوتا تو لوگ حماقت سے محفوظ رہتے۔

صاحب سے کہا کہ بیٹا باقی اٹھانوے جو تم نے بنائے ہیں وہ تم کھالو اب وہاں تھا کیا کھانے کو، وہ تو سب زبانی جمع خرچ تھا۔

بنیوں کی حکایات

جیسے حکایت ہے کہ ایک مُنیم (۱) حساب کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا ہاتھ لگے دو ہاتھ لگے چار ایک فقیر سنتا رہا اور اس کے ہاتھ لگوں کو جوڑتا رہا جب سو دو سو ہاتھ لگ چکے تو کہا منیم جی ایک پیسہ ہمیں بھی، اُس نے کہا بھئی اس وقت ہے نہیں فقیر کہنے لگا تم نے میرے سامنے اقرار کیا ہے کہ اتنے ہاتھ لگے منیم نے کہا وہ تو کاغذ ہی میں ہیں سچ مچ ہاتھ نہیں لگا۔ ایک اور حکایت یاد آ گئی ایک بنیا محاسب تھا (۲) کہیں لالہ صاحب کنبے سمیت بہلی میں (۳) جا رہے تھے راستہ میں دریا آیا تو آپ نے بانس لیکر پانی ناپا، کنارہ پر دیکھا کتنا ہے اور درمیان میں دیکھا کتنا ہے اس کے بعد آپ نے اوسط لگایا تو اوسط کمر تک نکلا بہلی بان (۴) سے کہا چل پانی کا اوسط کمر تک ہے وہ چلدیا جب ڈوبنے لگے تو پھر پوتھی (۵) نکال کر حساب جانچا شاید غلط ہو مگر حساب صحیح تھا اس پر آپ فرماتے ہیں لیکھا (۶) جوں کا توں کنبہ ڈوبا کیوں۔

علماء ظاہری اور علماء معانی میں فرق

حضرت جہاں واقعیت کی ضرورت ہو وہاں اعتبارات سے کیسے کام چلے پس اہل رسوم الفاظ کے چکر میں رہتے ہیں اور اہل معانی دور پہنچ جاتے ہیں اور ہم اُن پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ بات کو نہیں سمجھتے اور وہ ہمارے اعتراض کا جواب تک بھی نہیں دیتے کہ اس میں مشغول ہو کر سفر کھوٹا ہو جائیگا (۷) بلکہ اگر کسی کو اپنے ہمراہیوں میں سے جواب کے درپے ہوتا دیکھا تو اُس کو خطاب کر کے کہتے ہیں ؎

(۱) منشی (۲) حساب داں (۳) بیل گاڑی (۴) بیل گاڑی چلانے والے (۵) حساب والی کتاب (۶) معاملہ (۷) ان کے جواب میں مشغول ہونے سے میرا سفر منزل خراب ہوگا۔

با مدعی مگوئید اسرار عشق ومستی بگذارتا بمیرد در رنج خود پرستی(۱)

چپ چاپ آگے چلے جاتے ہیں حتی کہ باغ قدس(۲) میں جا پہنچے اور یہ الفاظ کے چکر میں پڑا رہا۔ میں اس میں گفتگو کررہا تھا کہ نزول کی حدیث میں ظاہر بین تو لفظ کی تحقیق میں پڑ گئے اور اہل بصیرت نے اس کے مقتضا پر عمل کیا کہ اس وقت کی قدر کی۔ اسی طرح ہم لا اقسم میں ''لا'' کو زائد کہہ کر نازاں ہوگئے اور اپنے آپ کو محقق سمجھنے لگے اول تو محقق ہی کیا ہوئے اور ہوئے بھی تو الفاظ کے، مگر یہاں تو دوسری چیز کی ضرورت ہے یعنی عمل کی کسی نے خوب کہا ہے ؎

مغرور سخن مشوکہ توحید خدا واحد دیدن بود نہ واحد گفتن (۳)

واقعیت حاصل ہونی چاہیے۔ نرے الفاظ سے کام نہیں چلتا۔

مخلوقات کی قسم کھانے میں حکمت

بہرحال ترکیب میں جب ''لا'' زائد ہوا تو لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ کے معنی ہوئے میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی یعنی مکہ کی۔ میں ہر لفظ کے ساتھ مختصر علوم بیان کرنا چاہتا ہوں اس میں یہ بات بیان کرنا ہے کہ غیر اللہ کی قسم کھانا جائز نہیں رکھا گیا مگر حق تعالیٰ نے بہت جگہ غیر اللہ کی قسم کھائی ہے۔ سو اول تو وہ حاکم ہے اُس کے افعال میں چون وچرا(۴) کی مجال نہیں اس لئے یہ سوال ہی بیکار ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حکمت اور غرض اصلی قسم کی، تاکید کلام ہے اور تاکید کے دو طریق ہیں ایک تو معظم (۵) کی قسم کھانا اور دوسرا طریق ایسی چیز کا ذکر کرنا جس میں غور کرنے سے جواب قسم کی تائید ہو جس سے یہ کلام بمنزلہ قضایا قیاسا تھامعھا کے ہوجاتا ہے یعنی ایک ایسی چیز کا پتہ دیدینا کہ اُس میں غور کرنے سے صدق کلام معلوم ہوجائے جب

(۱) ''ظاہر پرستوں کے سامنے عشق ومستی کے اسرار مت بیان کرو بلکہ ان کو رنج خود بینی میں مرنے دو'' (۲) جنت (۳) ''کلام کی موشگافیوں میں نہ رہو اس لئے کہ توحید کا مطلب خدا کو ایک دیکھنا اور سمجھنا ہے ایک کہنا نہیں'' (۴) کچھ کہنے کی گنجائش نہیں (۵) قابل تعظیم۔

یہ سمجھ لیا تو سنو کہ پہلی قسم میں لازم ہے کہ مقسم بہ غیر اللہ نہ ہو (۱) کیونکہ ایسی تعظیم بالغ صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے (۲) اور دوسری قسم میں غیر اللہ کی قسم بھی فی نفسہ (۳) جائز ہے اور اسکا مقتضا تو یہ تھا کہ مخلوق کے لئے بھی یہ قسم جائز ہوتی مگر چونکہ یہ غرض مشہور ومتعارف نہیں ہے اس لئے ذہن سبقت (۴) کریگا پہلی قسم کی طرف اس واسطے سدّا للباب وصوناً عن الایھام (۵) مطلقاً غیر اللہ کی قسم کو ممنوع کر دیا گیا کیونکہ اعتبار، غالب احوال کا ہوتا ہے اور غالب یہی ہے کہ معظم کی قسم کھا کر کلام کی تاکید کرتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ نے جو بعض مخلوق کی قسم کھائی ہے اسمیں قسم اول کا تو شبہ بھی نہیں ہوسکتا اس لئے اُن سے بڑا کون ہے اس لئے لامحالہ دوسری غرض کی طرف ذہن جاویگا اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے اللہ کا شکر ہے کہ نئی بات سمجھادی۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو یہ شبہ جاتا رہا کہ غیر اللہ کی قسم کیوں کھائی گئی۔

مقسَم بہ اور مقسَم علیہ میں تعلق

بس اب غور کرنا چاہیے کہ مقسم بہ کو مقسم علیہ سے تائید کا کس طرح علاقہ ہے سو اس جگہ مقسم علیہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ (۶) ہے یعنی ہم نے انسان کو سختی میں پیدا کیا ہے اب مقسم بہ میں غور کیا جاوے کہ اُس سے اس مضمون کی تائید ہوتی ہے یا نہیں سو مقسم بہ مکہ معظّمہ ہے اور اس کی شان فی نفسہ ونیز باعتبار اضافت کے سخت ہے کیونکہ وہ وادی غیر ذی زرع ہے (۷) اور وہاں گرمی بھی بڑی سخت ہے بس اس سے خود مشقت کا پتہ لگتا ہے۔ بس صاف معلوم ہوگیا کہ اس مقسم بہ کو دخل ہے مقسم علیہ کے اثبات میں بطور اثبات النظیر بالنظیر کے یہ تو اس کی شدت تھی فی نفسہ اور اضافی شدت یہ ہے کہ مکہ میں حضور کا زمانہ بہت مشقت کا تھا تو اس کا

(۱) جس کی قسم کھائی جائے وہ اللہ کے سوا نہ ہو (۲) ایسی عمدہ تعظیم صرف اللہ کا حق ہے (۳) اپنی ذات کے اعتبار سے (۴) اس لئے پہلی قسم کی طرف منتقل ہوگا (۵) اس لئے اس وہم کا دروازہ بند کرنے کے لئے غیر اللہ کی قسم کھانا ممنوع قرار دیا گیا (۶) سورۃ البلد:۴ (۷) ایسی آبادی ہے جہاں کھیتی باڑی نہیں ہوتی۔

ذکر مذکّر ہوگیا(۱) مشقتوں کا خاص کر جبکہ ''حلٌّ'' کے معنی نازل کے ہوں یعنی آپ کی اقامتِ مکہ کے زمانہ میں مکہ کی قسم کھائی یہ تو علمی اور تاریخی توجیہ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاک پا کی قسم

اور عشاق نے اس انـــت حـل سے کچھ اور سمجھا ہے اور قرآن مجید کی یہ حالت ہے ؎

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را(۲)

اور وہ کیا سمجھا ہے عشاق نے یہ سمجھا ہے کہ اس میں آنحضرت ﷺ کی جلالت شان کی طرف اشارہ ہے کیونکہ مطلقاً مکہ کی قسم نہیں کھائی بلکہ جب آپ اُس میں رونق افروز ہوں عشاق کے محاورہ میں گویا آپ کے خاک پا کی قسم کھائی ہے اور اس میں عربیت متروک نہیں ہوئی بلکہ لغت سے متأید ہے اس لئے یہ محض نکتہ ہی نکتہ نہیں ہے۔ بس عشاق کا ذہن اس طرف گیا کہ آپ کی ذات تو بہت بڑی ہے جبکہ آپ کے نزول سے مکہ قابل قسم ہوگیا۔ مگر اس عنوان محبت سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ خدا عاشق ہے (نعوذ باللہ منہ) اس کا دعویٰ لفظاً ومعنًی خلاف واقع ہے لفظاً تو اس طرح کہ یہ لفظ قرآن وحدیث میں عام طور سے نہیں آیا ہے۔

تشریح حدیث

یعنی بجز ایک روایت کے کہیں عشق کا مادہ مستعمل نہیں ہوا پھر وہ روایت بھی مختلف فیہ ہے وہ روایت یہ ہے من عشق فعَفَّ وکتم ومات فھو شھید(۳) اور دوسری حدیث سے عِفّت کی تفسیر مفہوم ہوئی ہے العینان تزنیان والرجلان

(۱) مکہ کا ذکر ان مشقتوں کو یاد دلانے کا ذریعہ ہوگیا (۲) ''اس کے عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل وجان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل وجان کو بُو سے تازہ رکھتی ہے'' (۳) جو کسی کے عشق میں مبتلا ہوا اور اپنی پاکدامنی کو محفوظ رکھا کسی سے اس کا تذکرہ تک نہ کیا حتی کہ اسی حالت میں مرگیا وہ حکما شہید ہے۔ تخریج: المغنی عن حمل الاسفار، کتاب کسر الشھوتین: رقم الحدیث: ۲۸۰۷۔

تزنیان والیدان تزنیان (۱) یعنی ہاتھ پاؤں اور آنکھ سب زنا کرتے ہیں پس معلوم ہوا کہ عفت میں ان سب کا محفوظ رکھنا لازم ہے نیز اُسی حدیث میں القلب یزنی بھی فرمایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ محبوب کا تصور بھی قصداً نہ کرے کہ یہ قلب کا زنا ہے اور اس تصور کا حدوث غیر اختیاری گو معاف ہے مگر اُس کا بقائے اختیاری معاف نہیں جیسا کہ نظر فجاءۃ کا حکم ہے کہ اگر اس کو باقی رکھا جاوے تو معصیت ہے لوگ تصور کو ممنوع ہی نہیں سمجھتے حالانکہ یہ جڑ ہے سارے مرض کی اور اسی سے قلب میں گھر ہوجاتا ہے بس عف کے یہ معنی ہوئے کہ اُس کا تصور تک نہ کرے اور اس کے بعد کتم ومات فرمایا کہ اسی مشقت میں مرگیا اور آخر تک عفیف رہا تو شہید ہوگا۔ اس حدیث کا مضمون تو قواعد سے صحیح ہے کیونکہ وہ شخص سخت مجاہدہ میں رہا اس واسطے شہادت کا درجہ ملے گا لیکن سند اس حدیث کی متکلم فیہ ہے (۲) بعض نے موضوع تک کہا ہے۔ غرض یہ ہے کہ اگر اس روایت کو صحیح بھی مان لیا جاوے تب بھی یہ بات ظاہر ہے کہ یہ لفظ کثرت سے استعمال کرنے کا نہیں ہے۔

لفظ عشق کے استعمال کی ممانعت

خصوصا خدا تعالیٰ کے تعلق کو جو بندہ کے ساتھ ہے عشق کہنا اور بھی برا ہے کیونکہ عشق کا لفظ محاورہ کے اعتبار سے دلالت کرتا ہے عاشق کے احتیاج وافتقار پر (۳)۔ اور جس لفظ سے احتمال ہو افتقار خداوندی کا وہ لفظ قابل ترک ہے۔ حضور سے ایک اعرابی نے کہدیا تھا نستشفع باللّٰہ علیك (۴) یعنی شفیع لاتے ہیں ہم آپ کے پاس خدا کو۔ رواہ ابوداؤد آپ سخت ناراض ہوئے اور اس کہنے سے بشدت منع فرمایا کیونکہ شفاعت کا لفظ بتلاتا ہے کہ جس کے ہاں شفاعت لائی جاوے وہ شفیع سے معظم (۵) ہے یہ خرابی معنوی ہے اس میں خلاصہ یہ کہ عشق کا

(۱) تخریج: المعجم الکبیر، باب العین، عبداللہ بن مسعود الہذلی: رقم الحدیث: ۸۶۶۱ (۲) اس کی سند میں کلام ہے (۳) عاشق محتاج وضرورت مند ہے (۴) تخریج: سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب فی الجہمیۃ: رقم الحدیث: ۴۷۲۸ (۵) بڑا ہے۔

لفظ خدا تعالیٰ کی شان میں ہرگز نہ استعمال کرنا چاہئے کیونکہ اس میں لوازم مذکورہ کا ایہام ہے اور وہ جائز نہیں۔ بعض شاعروں نے بہت ہی بے باکی کی ہے کہ لوازم قبیحہ کے ایہام سے تجاوز کر کے ان کی تصریح کر دی جیسا کہ بعض نے خدا اور رسول کو دولہا دولہن بنایا ہے خدا کی پناہ یہ شخص قرآن کی صاف نفی کرتا ہے وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ(۱) اور ایک شاعر نے کہا ہے ؎

پئے تسکین خاطر صورت پیراہن یوسف محمد کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا قد کا

نعوذ باللہ یہ تو خدا تعالیٰ کو قیاس کرنا ہے بندوں پر اول تو یہی افتراء عظیم ہے کہ اس کو دل بہلانے کی ضرورت ہو اور اگر اس محال کو فرض کر لیا جائے تو کیا اللہ میاں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں نظر نہیں آتے تھے جو سایہ رکھنے کی ضرورت ہوئی۔

شعراء کی بے اعتدالیاں

مگر شاعروں کے ہاں تو نئی بات اور تک بندی کی قدر ہے چاہے مضمون کفر ہی ہو اکثر شاعر بیبا کی کرتے ہیں۔ اور جہلاء کا کیا ذکر افسوس ہے کہ ایک عالم نے شعر ذیل کہا ہے اور عالم بھی محض نام کے نہ تھے بلکہ سچ مچ عالم تھے مگر شاعری کے خبط(۲) میں آپ کو کچھ نہ سوجھا اور یہ شعر لکھ مارا ؎

طواف کعبہ مشتاق زیارت کو بہانہ ہے کوئی ڈھب چاہیے آخر رقیبوں کی خوشامد کا

اول تو مضمون خلاف ایمان دوسرے خلاف تاریخ کوئی اُن سے پوچھے کہ کیا مدینہ کے ہر راستہ میں مکہ شریف آتا ہے شاعر نے شاید جغرافیہ نہیں پڑھا اور گو میں نے بھی نہیں پڑھا مگر اتنی بات تو سننے سے سب کو ہی معلوم ہے کہ مدینہ کے اور بھی راستے ہیں پھر خود اہل مدینہ بھی کعبہ کا طواف کرتے ہیں شاعر صاحب ان کی نسبت کیا کہیں گے کچھ نہیں سب خُرافات(۳) ہے یہ شاعر صاحب بہت بڑے علامہ تھے

(۱) اس کی کوئی بیوی نہیں۔ الانعام: ۱۰۱ (۲) جنوں (۳) بے ہودہ۔

مگر بدعتی تھے شاعری کے نشہ میں ایسی جرأت کر بیٹھے۔ ان بدعتیوں کو بڑی جرأت ہوتی ہے یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں خدا تعالیٰ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی گستاخی سے بھی باک نہیں کرتے (۱) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب تو ہمارا ایمان ہے مگر کیا حضور کی مدح کے واسطے خدا کی بے ادبی کی بھی اجازت دیدی جاوے، انبیاء علیہم السلام کی توہین کی بھی اجازت دیدی جاوے، کیا خدا تعالیٰ اور انبیاء علیہم السلام کی گستاخی مدح رسول ہے خدا کی پناہ ان لوگوں کی عقلیں مسخ ہوگئی ہیں کہ جب ان کو خدا اور رسول کی اہانت اور گستاخی سے روکا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ رسول کی مدح و تعظیم سے روکتے ہیں۔ اگر کوئی بے وضو اور بے غسل نماز پڑھنے لگے اور اس کو روکا جائے کہ اس حالت میں نماز مت پڑھ بلکہ وضو غسل کر کے پڑھنا چاہئے تو کیا اس کو مانع صلوٰۃ کہا جاویگا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ یہ اُن لوگوں کا ذکر تھا جو محبت میں حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں لیکن اگر حدود میں رہ کر قسم کی یہ توجیہ کی جاوے کہ اس قسم میں وَاَنْتَ حِلٌّ م بِھٰذَا الْبَلَدِ کی قید سے حضور ﷺ کی جلالت شان و محبوبیت کی طرف اشارہ ہے اور گویا حضور کی خاکپا کی قسم کھانا ہے تو یہ جمع بین الادب والعشق ہے (۲) یہ توجیہ تو اہلِ محبت کے مذاق پر تھی۔

''لا اقسم'' کی دوسری توجیہ

اور ایک توجیہ اہلِ عقل کے مذاق پر یہ ہوسکتی ہے کہ اس قسم میں تو حسب تقریر سابق وہاں اس کی مشقتوں کا ذکر ہے اس کو سن کر یہ خیال ہوتا کہ خدا جانے کب تک یہ مشقت رہے گی۔ اس لئے بطور جواب فرماتے ہیں کہ آپ اس میں نزول اجلال فرمانے والے ہیں یعنی آپ وہاں کے بادشاہ ہوں گے پس اس بشارت سے مشقت میں تخفیف ہوگئی کیونکہ اُس مشقت کے زوال کی امید ہوگئی اور ممکن

(۱) خوف نہیں کرتے (۲) ادب اور محبت دونوں کے تقاضہ کے موافق ہے۔

ہے کہ سورہ والتین میں بھی الْبَلَدِ الْاَمِیْن کی قسم اسی وجہ سے ہو کہ اُس میں بھی جواب قسم میں ایک جزو مشقت کا مذکور ہے ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْن وہ جزو خاص اس قسم کے مناسب ہو جاوے گا اور دوسرے اجزاء دوسری قسموں کے مناسب ہو جاویں گے۔

بخلاء کی حکایات

والتین پر ایک قصہ یاد آ گیا کہ ایک بخیل کے پاس ایک بدوی (۱) آیا اتفاق سے بخیل صاحب انجیر کھا رہے تھے بدوی کو دیکھ کر انجیر کمّان (۲) کے نیچے چھپا دیے اور بدوی سے بات ٹالنے کے واسطے دریافت کیا کہ تم کو کچھ قرآن یاد ہے اُس نے کہا ہاں اور بسم اللہ کر کے پڑھنا شروع کیا وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ۔ بخیل نے کہا ایـن التین یا اخی کہ والتین کہاں گئی اس کو کیوں نہیں پڑھا۔ بدوی نے جواب دیا ھـوتحت کساء ك یعنی وہ تیرے کمل کے نیچے ہے۔ بخل پر ایک اور واقعہ ہے ایک بخیل کے ہاں مہمان آ گیا کھانے کا وقت آ گیا چاہا کہ بہانہ کر کے گھر جا کر کھانا کھالے اس طرح سے کہ مہمان کو خبر نہ ہو۔ اس لئے پاخانہ کا بہانہ کر کے گھر گئے اور یہ بہانہ ایک معنی کر صحیح بھی تھا کیونکہ شمس بازغہ میں اکل کی ایک غایت تغوط (۳) بھی لکھی ہے پس اُس نے اصل غایت کا بیان کر دیا تو کیا برا کیا۔ القصہ اس بہانہ سے چپ چاپ کھانا کھا کر واپس آیا اور اتفاق سے کھاتے میں مونچھوں میں ایک چاول لگا رہ گیا وہ مہمان صاحب دیکھ کر کہتے ہیں۔ میاں صاحب آپ کی مونچھوں میں پاخانہ لگا ہوا ہے ذرا صاف کر لیجئے۔ یہ تو استطرادی مضمون تھا اب عود کرتا ہوں (۴) کہ یہ تو پہلی قسم کا بیان تھا بہر حال اثبات مشقت میں اس قسم کو دخل ہے جیسا کہ مفصل بیان ہو چکا۔

(۱) دیہاتی (۲) کمبل، چادر (۳) ہگنا (۴) اب اصل مضمون دوبارہ بیان کرتا ہوں۔

ماں باپ کی مشقت

دوسری قسم والد وما ولد کی ہے اور والد میں صیغہ کی تذکیر سے موصوف کی تذکیر مقصود نہیں ہے بلکہ یہاں جنس مراد ہے اور شامل ہے ماں کو بھی، ترجمہ یہ ہے کہ ماں باپ اور بچوں کی قسم اس میں بھی وہی اشارہ ہے مشقت کی طرف اور یہ مشقت زیادہ ہے جس کو دوسری جگہ تفصیلا فرمایا ہے حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ(۱) اور والد کو اگر بالکل ہی مشقت نہ ہوتی تو لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ(۲) نہ فرمایا جاتا گو ولادت وغیرہ میں ماں کو بہت تکلیف ہوتی ہے لیکن روپیہ تو بیوی بچوں کی سب ضرورتوں میں باپ ہی دیگا اس بیچارے پر یہ کیا کچھ کم مصیبت ہے اور یہ مشقت چونکہ ثقیل تھی اس لئے مَوْلُوْدٌ لَّهٗ کہہ کر اس کی مشقت میں تخفیف کردی یعنی یہ تیرا ہی تو ہے اگر کچھ تکلیف ہوتی ہے تو کیا مضائقہ ہے قاعدہ ہے کہ اپنا ہونے کی وجہ سے گرانی نہیں ہوتی اس تصور سے تشدید(۳) میں کمی ہوجاتی ہے مگر وہ تشدید(۴) مراد نہیں جو ابوداؤد پڑھاتے ہوئے ایک طالب علم نے گھڑا تھا۔ قصہ یوں ہوا کہ جب ابوداؤد میں تشدید فی البول کا باب آیا تو میں نے دریافت کیا کہ بول میں تشدید تو کسی حرف پر بھی نہیں پھر اس کو ترجمۃ الباب کیسے باندھا ایک صاحب بولے کہ یہ تو شرح وقایہ کا سوال ہے۔ خدا جانے وہ کیا سمجھا ہوگا۔ اور یہ تو والد یعنی ماں باپ کی مشقت کا بیان تھا۔

بچوں پر مشقت

اب میں مـاولد کے متعلق بیان کرتا ہوں کہ صاحبزادہ پر کیا مشقت گذرا کرتی ہے وہ مشقتیں یہ ہیں کہ اول تو وہ بیچارہ محتاج ہے بجز اس کے کہ روتا رہتا ہے خود کچھ کرنہیں سکتا کیا یہ مشقت نہیں۔ دوسرے اکثر پٹتا ہے پھر بہ نسبت بڑی عمر کے

(۱) اس کی ماں نے بوجھ پر بوجھ اٹھایا لقمان:۳۱/۱۴ (۲) البقرۃ:۲/۲۳۳ (۳) سختی (۴) حرف کو مشدد پڑھنا مراد نہیں۔

بچہ بیمار بھی بکثرت ہوتا ہے اور اس سے گو والدین کو بھی تکلیف ہوتی ہے مگر معروض بالذات (۱) تو یہی صاحبزادہ ہے اور سب سے بڑی مصیبت بچوں کو مکتب جانے کی ہے۔ مامون رشید بادشاہ کا لڑکا اور اُس کا ایک خادم پڑھنے جایا کرتے تھے خادم کا انتقال ہوگیا مامون نے یہ خیال کر کے کہ اس کا رفیق تھا اس لئے رنج ہوا ہوگا کلمات تعزیت کے کہے شاہزادہ نے کہا کہ بہت اچھا ہوا جو مر گیا کیونکہ مکتب کی مصیبت سے چھوٹ گیا یہ یاد نہیں رہا کہ یہ قصہ مامون رشید کا ہے یا ہارون رشید کا کسی تاریخ میں دیکھا تھا۔ اور ایک قصہ زبانی سنا ہے کہ ایک شخص کو پھانسی دینے کے واسطے لیجا رہے تھے وہ بیچارا رو رہا تھا لڑکوں نے اُس کے رونے کا سبب پوچھا اُن کو بتلا دیا گیا تو لڑکے کہتے ہیں بھلے مانس روتا کیوں ہے مکتب میں تو نہیں لے جاتے اور روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ چھٹی کے بعد تو مکتب سے بھاگتے ہوئے جاتے ہیں اور آتے ہیں آہستہ آہستہ اور جمعرات کو دیکھئے تو خوش خوش، کہ کل کو چھٹی ملے گی اور جمعہ کی شام کو پژمردہ (۲) کہ کل گرفتاری کا دن ہے یہ تو نفسِ مکتب کی مشقت ہے اور جو اُستاد صاحب کوئی قصائی مل گئے (۳) تو کچھ نہ پوچھئے صورت دیکھ کر کانپ اُٹھتے ہیں اور جو کسی دن اُنکا ہاتھ پڑ گیا تو خیر نہیں خاص کر اگر وہ استاد صاحب اندھے بھی ہوئے تب تو مصیبت بلکہ مصائب پر مصائب ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ ایک اندھے حافظ جی لڑکے کے سر کو ٹانگوں میں دبا لیتے تھے اور بے تحاشا کمر میں گھونسے مارا کرتے تھے میں تو اتنے مارنے کو حرام سمجھتا ہوں کیا یہ تھوڑی مشقت ہے۔ پھر تھوڑے دنوں میں اونٹ کے گلے میں بلی باندھ دی جاتی ہے جس کو شادی کرنا کہتے ہیں اور شادی کو خوشی کی بات سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت سخت تکلیف کی چیز ہے۔

(۱) اصل مصیبت تو اس بچہ پر ہی پڑتی ہے (۲) افسردہ دل (۳) کوئی مارنے والے استاد مل گئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذکاوت

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے دریافت کیا تھا کہ شادی کیسی چیز ہے آپ نے فرمایا سرور شھر یعنی ایک ماہ کی خوشی ہے سائل نے کہا ثم ما ذا پھر کیا ہوتا ہے فرمایا لزوم مھر (۱) اس نے پھر پوچھا ثم ماذا (۲) فرمایا کسور ظھر (۳) اس نے کہا ثم ماذا فرمایا غموم دھر یعنی عمر بھر کا غم لگ جاتا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ بڑے فصیح تھے کیا فصیح اور مقفی (۴) جواب دیئے ہیں یہ جو مسئلہ ممبر یہ فرائض میں معروف ہے اُس سے بھی آپ کی غایت فصاحت وذکاوت ثابت ہوتی ہے اس کا قصہ یہ ہے کہ آپ خطبہ پڑھ رہے تھے جس کا قافیہ اس طرح تھا۔ الحمد للّٰہ الذی الیہ الرجعی۔ وتجزی کل نفس بما تسعٰی ۔عین خطبہ میں ایک شخص نے صورت واقعہ کی بیان کر کے زوجہ کو آٹھواں حصہ نہ ملنے پر اشکال کیا آپ نے فی البدیہہ جواب دیا یا صار ثمنھا تسعا جواب میں قافیہ تک نہیں بدلا اور پھر خطبہ اُسی قافیہ پر چلتا رہا۔ مطالب السؤال ایک کتاب ہے اس میں آپ کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ آپ کی مجلس میں ذکر ہوا کہ زیادہ تر دائر کلام میں (۵) کون سا حرف ہے سب نے اس پر اتفاق کیا کہ الف ہے اور اسی پر بطور تفریع یہ بھی کہا گیا کہ کوئی طویل کلام الف سے خالی نہیں ہوسکتا اور تو سب نے اس پر اتفاق کیا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خالی ہوسکتا ہے اور فرمایا لکھو میں طویل کلام بغیر الف لکھواتا ہوں اس پر ایک خطبہ پڑھا جو تین صفحوں کا ہے اس میں الف کا نام نہیں ہے اور آپ کے اور فضائل بھی عجیب وغریب ہیں میں کہتا ہوں ایسے باکمال شخص نے جب صدیق اکبر سے بیعت کی تو اس سے زیادہ اور کیا شہادت ہوگی افضلیت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر خاص کر جبکہ اسد اللہ بھی ہوں سب کو معلوم ہے کہ وہ بڑے

(۱) مہر لازم ہوجاتا ہے (۲) پھر کیا ہوگا (۳) کمر ٹوٹ جائیگی (۴) ایسا جواب دیا جس میں قافیہ کی رعایت تھی (۵) کلام میں استعمال ہونے والا۔

شجاع تھے پھر باوجود ایسی شجاعت کے مغلوب کیسے ہوسکتے تھے تو یہ کہنا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ دل سے بیعت نہیں ہوئے تھے درحقیقت حضرت علی پر تہمت ہے اور ان کی تنقیص ہے(۱) بھلا یہ ہوسکتا ہے کہ ایسی شجاعت اور ایسے کمالات اور پھر بھی تقیہ کی وجہ سے بیعت ہوگئے نعوذ باللہ منہ یہ واقعات استطراداً بیان میں آگئے اصل مقصود شادی کے موقع پر جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقولہ تھا اس کا ذکر کرنا تھا جس کا مقصود یہ ہے کہ جو فرحت افزا واقعہ کہلاتا ہے وہ بھی سراسر کُلْفَتْ(۲) ہے جس دن شادی ہوگئی تو گویا آج گاڑی میں جُتے ہیں اور جو کہیں بال بچے ہوگئے تو پوری مشقت سر پر آپڑتی ہے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے جب تک آدمی مجرد(۳) رہتا ہے انسان ہے اور جب شادی ہوجاتی ہے تو چار پایہ ہوگیا اور بال بچے ہوکر مکڑ بن جاتا ہے بہرحال سب مصیبت ہی مصیبت ہے۔

ہر چیز شان خداوندی کا مظہر ہے

اور اس مقام پر اور اشیاء کی قسم بھی ہوسکتی ہے مگر خدا تعالیٰ نے اُن چیزوں کی قسم کھائی ہے جو کہ ہمیشہ نظر میں رہتی ہیں تاکہ اُن کے مشاہدہ واستحضار سے فائدہ عام اور تام ہو اور اسی بناء پر اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ(۴) میں اونٹ میں غور کرنے کو فرمایا کہ وہ اکثر پیش نظر رہتا ہے ہر وقت استعمال میں رہتا ہے نہ اس واسطے کہ وہ بحسن متعارف حسین ہوتا ہے کیونکہ آیات خداوندی کا انحصار اہل حسن ہی میں نہیں ہے۔ عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

محقق ہماں بیند اندر ابل کہ در خوب رویاں چین وچگل(۵)

گو جن کی نظر آگے ہے وہ اونٹ وغیرہ کو بھی حسین کہتے ہیں مگر ایک خاص حیثیت سے جس کی تصریح اس شعر میں ہے ؎

(۱) نقص کو بیان کرنا (۲) مشقت (۳) غیر شادی شدہ (۴) الغاشیۃ: ۱۷ (۵) ''محقق آدمی اونٹ میں بھی وہی کچھ دیکھتا ہے جو چین اور ترکستان کے حسینوں میں دیکھتا ہے''۔

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردۂ(۱)

اور میں اس کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں کہ اگر آئینہ میں سے محبوب کا عکس نظر آتا ہو مگر آئینے اپنے خواص میں مختلف ہوں تو کیا مختلف عکسوں میں سے کوئی عکس ایسا بھی ہے جو عاشق کو محبوب نہ ہو۔ نہیں بلکہ اس کو تو سب میں یکساں نظر آتا ہے تو پھر کیا اونٹ مظہر صنع حق نہیں ہے۔ کیا اُس میں شان خداوندی نظر نہیں آتی مگر اس کے واسطے نظر چاہئے ہر ایک آنکھ سے یہ شان نظر نہیں آسکتی۔ امیر شاہ خاں صاحب نے ایک حکایت لکھوائی ہے ایک بزرگ کی کہ وہ ہر حسین چیز پر عاشق ہوجاتے تھے لیکن یہ سن کر ہر شخص دعویٰ نہ کر بیٹھے کہ ہمارے نزدیک بھی ہر شئے آئینہ جمال الٰہی ہے اور پھر اس آڑ میں نفس پرستی کا اس کو خوب موقع ملے بلکہ اس کے واسطے کسی محقق کی تصدیق کی ضرورت ہے ۔

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خودرا عیسیٰ نتواں گشت بہ تصدیق خرے چند(۲)

کیونکہ غیر محقق کی تصدیق بھی کافی نہیں ہے تو پھر اپنی تصدیق تو کیسے کافی ہوگی اور اگر لوگوں کو دھوکہ بھی دیدیا تو کیا حق تعالیٰ سے بھی واقعہ کو چھپالیگا ۔

باخدا تزویر وحیلہ کے رواست(۳)

بس جب تک کوئی مبصر نہ کہدے اس وقت تک اعتبار نہیں ہے بہرحال جو شخص اپنے آپ کو خود ہی پارسا سمجھنے لگے اس کو حسین کی طرف نظر کرنا جائز نہیں ہے البتہ جو محقق ہیں اُن کو ہر چیز میں جمال خداوندی نظر آتا ہے جیسا کہ وہ بزرگ کہ ہر عمدہ چیز کی طرف میلان رکھتے تھے حتی کہ دو دو سو میل کا سفر کرکے عمدہ مکانوں کو دیکھنے گئے حصار کے علاقہ سے ایک شخص اونٹنی لے گیا اُن کو خبر ہوئی اُس کو

(۱) ''اپنی خوبیوں کو حسینوں کے چہروں میں نمایاں کرکے پس عاشقوں کی نظر سے اپنا جلوہ دیکھتے ہیں''
(۲) ''اپنے گوہر کو کسی صاحب نظر کے سامنے پیش کرو کہ یہ واقعی گوہر ہے یا کانچ کا ٹکڑا ہے کیونکہ چند گدھوں کے کہنے سے تم عیسیٰ نہیں بن سکتے'' (۳) ''خدا کے سامنے حیلے وحوالے کہاں چل سکتے ہیں''۔

دیکھنے گئے اور جا کر گلے سے لگالیا اور کہا سبحان اللہ کہاں ظہور فرمایا ہے ۔

بسکہ درچشم وجاں فگارم توئی ہرچہ پیدا میشود از دور پندارم توئی
حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ پس بچشم عاشقاں خودرا تماشا کردۂ(۱)

مگر یاد رکھو کہ خوب کا لفظ فقط حسین ہی پر نہیں بولا جاتا بلکہ ہر چیز پر اس کا اطلاق ہوتا ہے خلاصہ یہ کہ سب مظاہر ہیں جمال خداوندی کے اُن میں غور کرنا چاہئے تاکہ صانعیت (۲) خدا کا مراقبہ راسخ ہوجاوے اور ان میں بھی جو چیزیں ہر وقت پیش نظر رہتی ہیں وہ زیادہ قابل توجہ ہیں اور قسم کے لئے ایسی ہی چیزیں اختیار کی گئی ہیں اور ان چیزوں کے ہر وقت پیش نظر رہنے سے یہ خیال نہ کیا جاوے کہ مبتذل درجہ کی قسم ہے کیونکہ ابتذال تو بے موقع ہونے سے ہوا کرتا ہے اور صرف عظیم الشان نہ ہونے کے سبب مبتذل خیال کرنا بہت بڑی حماقت ہے جیسا کہ جاہلیت والوں کی حماقت تھی کہ قرآن شریف میں مکڑی کا ذکر آنے کو معیوب کہتے تھے اور کہتے تھے کہ مکڑی اور مکھی کا ذکر قرآن شریف میں کیوں آیا ہے یہ تو معمولی چیزیں ہیں اُن کے جواب میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا(۳) یعنی اللہ تعالیٰ مچھر اور اُس سے چھوٹی چیز کی مثال دینے سے شرماتا نہیں کیونکہ مثال تو ممثل لہٗ (۴) کے مطابق ہوتی ہے پس ان مواقع پر یہ مثالیں بالکل مناسب ہیں اور جو بات بالکل ٹھیک ہو اس میں کسی کے اعتراض سے دب جانا کیا معنی۔

جواب دینے کے آداب

میں اس جگہ مصلحین و مبلغین کو ایک ضروری بات بتلاتا ہوں دیکھا جاتا ہے کہ ان کو یہ اہتمام ہوگیا ہے کہ ہر سوال کا جواب حکیمانہ دینا چاہتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اس سے اعتراض کی جڑ کٹ گئی مگر حقیقت میں جڑ پختہ ہوگئی کیونکہ اس سے

(۱) میری آنکھیں اور جان تجھ پر فدا ہیں دنیا میں جو بھی خوبصورت چیز پیدا کی گئی وہ تیرا ہی عکس ہے تو نے اپنا حسن حسینوں کے چہروں میں ظاہر کیا ہے پس اس طرح عاشقوں کی نظر میں خود کو آشکارا کیا ہے‘‘ (۲) خدا تعالیٰ کی کاریگری (۲) البقرۃ:۲/۲۶ (۴) وہ چیز جس کے سمجھانے کے لیے مثال دی جائے۔

تو وہ معترضین عادی ہوجاتے ہیں حکمت دریافت کرنے کے اور بدون (۱) حکمت معلوم ہوئے ہر جگہ شبہ کرتے ہیں تو پھر جڑ کہاں کٹ گئی جڑ تو اس سے کٹتی ہے کہ حاکمانہ جواب دیا جاوے۔ اصل میں آپ نائب ہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس لئے قرآن حدیث کا طرز دیکھ کر اُس کے موافق عمل کرنا چاہئے اور غور کیا جاوے تو قرآن میں کہیں تو حکمتیں بیان کی گئی ہیں گو اجمالاً سہی جیسا کہ تکوینیات میں ہے۔ ﴿ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ﴾ (۲) الآیۃ اور تشریعیات میں ارشاد ہے: ﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ (۳) اور کہیں حاکمانہ شان سے کام لیا گیا ہے جیسے ﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ﴾ (۴) اور اسکے ساتھ جو ارشاد ہے: ﴿ عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا ﴾ جو بظاہر حکیمانہ جواب ہے لیکن غور کر کے دیکھا جاوے تو سوالِ حکمت سے روکا ہے اور مطلب یہ ہے کہ زیادہ بک بک مت کرو، جاؤ کام کرو ممکن ہے کہ کوئی مصلحت ہو جس کا تم کو علم نہ ہو۔ یہ بالکل حاکمانہ شان ہے اور دیکھئے شیطان نے سجدہ نہ کرنے کے عذر میں صغریٰ کبریٰ بیان کیا تو خدا تعالیٰ نے اس کی بکواس کا بقاعدہ مناظرانہ جواب نہیں دیا، کیا نعوذ باللہ اسکا جواب مشکل تھا کچھ بھی مشکل نہیں، ہم جواب دے سکتے ہیں۔ مگر خدا نے صاف صاف جواب حاکمانہ طریق پر دیا اور فرمایا: ﴿ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۙ وَّاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ (۵) یعنی یہاں سے نکل تُو مردود ہے اور قیامت تک تجھ پر لعنت ہے۔ کیا غلاموں کے ساتھ فلسفہ کی گفتگو کی جاوے گی اور یہاں سے یہ بھی پتہ لگ گیا کہ اسلام میں شخصی سلطنت کی تعلیم ہے کیونکہ شخصی سلطنت حاکمانہ ہے اور جب وہ

(۱) جہاں حکمت سمجھ میں نہ آئے شبہ کرتے ہیں (۲) ''اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے اس کو لایعنی پیدا نہیں کیا'' آل عمران: ۳/۱۹۱ (۳) ''تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے اس توقع پر کہ تم متقی بن جاؤ'' البقرۃ: ۱۸۳ (۴) جہاد کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو گراں ہے۔ البقرۃ: ۲۱۶۔

سلطان نائب رسول ہے تو حاکمانہ شان زیبا ہے اور جب بادشاہ سے مباحثہ ہوتا ہو جیسا کہ سلطنت جمہوری میں دستور ہے تو حکومت کیا ہوئی۔

قرآن کریم کے جوابات

الغرض اہل علم کو چاہئے کہ معترضین کو ہمیشہ حکیمانہ جواب نہ دیا کریں بلکہ غالب اوقات میں حاکمانہ جواب دیا کریں اس سے شبہات کی جڑ کٹ جاتی ہے، دیکھو حق تعالیٰ شانہ نے مکھی مچھر کے ذکر کی حکمت اور لِم (۱) نہیں بیان فرمائی بلکہ حاکمانہ طور پر ارشاد ہے: ان اللہ لا یستحی الخ اور حکیمانہ جواب یہ ہے کہ مثال ممثل لہ کے مطابق ہوا کرتی ہے اور یہاں آلہہ باطلہ (۲) کا ضعف بیان کرنا ہے اور وہ جبھی ہوگا کہ یوں کہا جاوے کہ اگر اُن سے مکھی بھی کوئی چیز چھین لے تو کچھ نہیں کرسکتے اگر یوں کہا جاتا کہ اگر ان سے ہاتھی چھیننا چاہے تو کچھ نہیں کرسکتے تو اس سے غایت درجہ کا ضعف نہیں ثابت ہوتا گو اتنا ضعف بھی بطلان الُوہیت (۳) کے لئے بالکل کافی ہے مگر پوری حقیقت تو واضح نہ ہوتی اسی طرح فرماتے ہیں کَمَثَلِ الْعَنْکَبُوْت (۴) یہاں بھی مقصود مکڑی کے گھر کی مثال ہی سے حاصل ہوتا ہے اور قوی شئی کی مثال دینا ہرگز صحیح نہیں مگر نادان کفار نے اعتراض کیا اور باوجود یکہ حکیمانہ جواب نہایت واضح اور عام فہم موجود تھا مگر پھر بھی حق تعالیٰ حاکمانہ جواب فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَۃً فَمَافَوْقَھَا﴾ (۵) گویا مطلب یہ ہے کہ کرلو کیا کرتے ہو ہم ایسے لغو شبہات کی پروا نہیں کرتے یہ آزادی کا جواب ہے کسی سے دبنے والے کا کلام نہیں اور یہ بھی ایک بڑی علامت ہے قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کی مگر باوجود صفائی اور آزادی کے قرآن شریف میں تہذیب کی کامل

(۱) وجہ (۲) معبودانِ باطل (۳) اتنی کمزوری بھی ان کے معبود باطل ہونے کے لئے کافی تھی (۴) العنکبوت: ۲۹/۴۱ (۵) ہاں واقعی اللہ تعالیٰ تو نہیں شرماتے اس بات سے کہ بیان کردیں کوئی مثال بھی خواہ مچھر ہو خواہ اس سے بھی بڑھی ہوئی کوئی چیز ہو۔ البقرۃ: ۲/۲۶۔

رعایت کی گئی ہے کسی مقام میں تہذیب کو نہیں چھوڑا گیا اور بعض لوگوں نے جو اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا کو تہذیب کے خلاف کہا ہے تو اُس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ فرج کے معنی گریبان کے ہیں اور اس کا مفہوم قریب قریب پاکدامن کے مفہوم کے ہے میں نے ایک عالم کے سامنے یہ مضمون بیان کیا تھا انہوں نے کہا کہ کئی سال سے یہ مضمون دل میں آتا تھا مگر تعبیر نہیں کرسکتا تھا اللہ کا شکر ہے کہ آج تعبیر بھی معلوم ہوگئی۔

خلاصہ یہ کہ کفار کے اعتراض پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ (۱) کہ بیشک خدا نہیں شرماتا مچھر کی مثال دینے سے یا اس کی جو اس سے بڑھ کر ہو یعنی صغر (۲) میں اور فرماتے ہیں: فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الآیۃ یعنی جو ایمان لائے وہ بدوں کاوِش (۳) کے حق سمجھتے ہیں اور کافر بے جا اعتراض کرتے ہیں محض عناد سے۔ یہ صاف حاکمانہ جواب ہے اور حاکمانہ جواب سے متاثر ہونے والوں کی مدح ہے۔

حکیم الامت کا حاکمانہ جواب

اس پر ایک واقعہ مجھ کو یاد آیا علیگڑھ میں کالج کے ایک فاضل پروفیسر نے مجھ سے سوال کیا کہ حدیث میں آیا ہے جب فاحشہ پھیل جاوے تو وبا پھیلتی ہے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی میں نے کہا کیا حدیث کا مدلول سمجھ میں نہیں آیا یا سزا اور جرم میں ربط کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی، تشقیق سے اس لئے سوال کیا کہ انہوں نے حدیث عربی الفاظ میں پڑھی تھی انہوں نے کہا وجہ مناسبت وارتباط سمجھ میں نہیں آتی۔ میں نے کہا تو اس سے ضرر کیا ہے۔ سوچ کر جواب دیا کہ ضرر تو کچھ بھی نہیں لیکن اگر معلوم ہوجائے تو نفع ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا نفع ہے۔ کہا اطمینان، اس پر میں نے سوال کیا کہ اطمینان مطلوب ہونے کی کیا دلیل ہے۔ کہا اگر اطمینان مطلوب نہ ہوتا تو ابراہیم علیہ السلام یوں نہ فرماتے: وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ۔ (۴) میں

(۱) البقرۃ:۲/۲۶ (۲) چھوٹے پن میں (۳) بغیر تحقیق وجستجو کے (۴) البقرۃ:۲/۲۶۰۔

نے کہا کہ یہ کیا ضرور ہے کہ جو چیز اُن کو مفید تھی وہ آپ کو بھی مفید ہے بس خاموش ہوگئے۔ اب میں اس کی تفصیل بیان کرتا ہوں کہ حضرت ابراہیمؑ کا اطمینان قطعیات سے حاصل ہوا تھا اور یہ ظنیات سے حاصل ہوتا اور دونوں میں فرق ظاہر ہے اور جب وہ جانے لگے تو میں نے کہا جناب یہ نہ سمجھئے کہ مجھ کو وجہ ربط معلوم نہیں مگر ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبری کہ نیست کہ نیست (۱)

سو میں نے یہ سب جواب حاکمانہ دیے۔

علماء کی شان

میں یہی کہہ رہا تھا کہ علماء حاکمانہ شان میں نائب رسول ہیں تو ان کو چاہئے کہ اس شان کا بھی لحاظ رکھیں۔ منادی کرنے والے کو اعلان کر دینا چاہئے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اُس سے اعلان کی حکمتیں پوچھے کوئی ایسا کریگا تو وہ جوڈنڈا ڈھول پر مار رہا ہے ایک اس کے بھی رسید کریگا ہاں اگر بھنگی ہوا تو اتنی جرأت نہ ہوسکے گی مگر کیا علماء بھنگی ہیں توبہ توبہ۔ پس جب کوئی حکمت دریافت کرے تو صاف جواب دیدو کہ یہ ہمارا کام نہیں ہے۔ ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے دریافت کیا کہ عورتوں کے معمولی ایام میں جو روزے فوت ہوں اُن کی تو قضا ہے اور نمازوں کی قضا نہیں اسکی کیا وجہ۔ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر خلاف کرو گے تو اتنی جوتیاں پڑیں گی کہ سر پر بال نہ رہیں گے اور مولانا کا مذاق اُن کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے فرماتے ہیں ؎

الوعظ ینفع لوبالعلم والحکم والسیف ابلغ وُعّاظ علی القمر (۲)

اور فرمایا کرتے تھے کہ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ (۳) میں

(۱) راز سے پردہ اٹھانے میں مصلحت نہیں ہے ورنہ رندوں کی محفل میں کوئی بات ایسی نہیں جس کی انہیں خبر نہ ہو (۲) اگر علم وحکمت سے وعظ کہا جائے تو فائدہ ہوتا ہے سرکشوں اور نافرمانوں کے لئے تلوار بہتر واعظ ہے (۳) ہم نے لوہا نازل کیا جس میں سختی ہے، سورۃ الحدید: ۵۷/۲۵۔

حدید سے نعلد ارجوتہ مراد ہے مجھ سے ایک شخص نے ایک مسئلہ کی نسبت دریافت کیا کہ اس میں کیا حکمت ہے میں نے جواب میں لکھا کہ سوال عن الحکمۃ میں کیا حکمت ہے (۱) بس قصہ ختم ہوگیا معلوم ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر ان چاپلوسی کرنے والوں کو مال یا جاہ مطلوب ہے ڈرتے ہیں کہ آزادی کا معاملہ کیا تو لوگ معتقد نہ رہیں گے۔ نہ رہیں گے نہ رہیں مارو گولی تمہاری تو یہ شان ہونی چاہئے۔

اہل اللہ کا حال

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو
دارو گیر وحاجت ودربان دریں درگاہ نیست (۲)

احمد جامؒ فرماتے ہیں ؎

احمد تو عاشقی بمشیخت تراچہ کار دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد (۳)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ لوگوں کے الگ رہنے سے لوگوں کو نفع کم پہنچے گا تو ثواب کم ملے گا۔ میاں اپنے کام میں لگو سنت کے موافق تھوڑا کام ہونے سے بھی تم کو اتنا ثواب ملے گا کہ تم لے بھی نہ سکو گے خواہ مخواہ کس جھگڑے میں پھنسے ہو آزاد رہنا چاہئے اور آزادی کی یہ شان ہونا چاہئے ؎

دلفریباں نباتی ہمہ زیور بستند دلبر ما ست کہ یا حُسنِ خدا داد آمد
زیر بار اند درختاں کہ ثمر ہا دارند اے خوشا سرو کہ زبند غم آزاد آمد (۴)

(ان دونوں شعروں کو حضرت والا نے مکرر پڑھا) یہ تعلقات اور شہرت حقیقت میں وبال ہیں سب سے الگ رہنا چاہئے ؎

(۱) حکمت کا سوال کرنے میں کیا حکمت ہے (۲) جس کا دل چاہے جائے جس کا دل چاہے آئے ہماری درگاہ میں نہ دربان ہے نہ پکڑ دھکڑ (۳) ''احمد تو عاشق ہے مشیخت سے تجھ کو کیا کام دیوانہ ہو جا سلسلہ ہوا ہوا نہ ہوا نہ ہوا'' (۴) ''حسینان جہاں کو بناؤ سنگھار کی ضرورت ہے اور ہمارے محبوب کو حسن خداداد حاصل ہے۔ پھل دار درخت زیر بار رہتے ہیں مبارک ہو سرو، کہ وہ تمام غموں سے آزاد ہے''۔

خویش را رنجور ساز وزار زار تاترا بیروں کنند ازاشتہار
اشتہار خلق بند محکم است بند این از بند آہن کے کم است
چشمہاؤ خشمہاؤ اشکہا برسرت ریزد چوں آب از مشکہا(۱)

ہاں خدا تعالیٰ باوجود گمنامی کے شہرت کسی کو دیدیں تو دوسری بات ہے اور دنیوی اغراض تو رہے الگ، مخلصین کے نزدیک تو بقاء سلسلہ کا خیال کرنا بھی شرک طریقت ہے۔ ایک شخص نے شکایت کی اپنے شیخ سے کہ مجھ کو نفع نہیں ہوتا شیخ نے کچھ شغل بتلادیئے پھر بھی وہی شکایت کی، کئی بار کے بعد دریافت کیا کہ تمہاری نیت اس مجاہدہ ریاضت سے کیا ہے کہا یہ ہے کہ کچھ آجاوے تو دوسروں کو نفع پہنچاؤں۔ فرمایا یہ تو شرک ہے اس خیال باطل کو چھوڑ دو یہی سدراہ ہے طالب کی توجہ شان ہونا چاہئے ۔

باوجودت زمن آواز نیاید کہ منم (۲)

اور

افروختن و سوختن وجامہ دَرِیدن پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت (۳)

عاشق حقیقی کا حال

یہ سب چیزیں عاشق کا شعار ہوتی ہیں اسی کو ایک اور کہتے ہیں مگر الفاظ آزادی کے ہیں ۔

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن دل بدست دگرے دادن وحیران بودن
سوئے زلفش نظرے کردن درویش دیدن گاہ کافر شدن وگاہ مسلمان بودن (۴)

(۱) خود کو شکستہ دل اور غمگین بناؤ تاکہ تمہاری شہرت ختم ہوسکے۔ مخلوق میں شہرت ختم ہونا ایک مضبوط بند ہے۔ یہ بند لوہے کے بند سے بھی مضبوط ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں غصہ کی بنا پر سر سے ایسے آنسو آرہے ہیں جیسے مشک سے پانی ٹپکتا ہے (۲) ''میرے وجود سے یہ آواز نہیں آنی چاہئے کہ میں کچھ ہوں'' (۳) ''یعنی افروختہ ہونا پروانہ نے' جلنا شمع نے' جامہ دری کرنا گل نے مجھ سے سیکھا ہے'' (۴) عاشقی کیا ہے محبوب کا بندہ ہوجانا ہے دل محبوب کے حوالے کرکے حیران ہوجائے وہ جو چاہے کرے چاہے حالت قبض میں رکھے یا حالت بسط میں اس کی طرف سے تفویض ہونی چاہیئے اس کے قرب پر نظر رکھے اور اس کا فقیر محتاج بن کر رہے وہ جو چاہے کرے چاہے فنا کرے یا باقی رکھے۔

اور ان الفاظ سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ تصوف میں کفر بھی کھپ جاتا ہے بلکہ یہ ایک اصطلاحی لفظ ہے۔ کافر کہتے ہیں اصطلاح میں فانی کو اور طالب فانی فی اللہ ہوتا ہے پس شعر کا مطلب یہ ہے کہ فنا اور بقا سالک کا نقد وقت ہوتا ہے (۱) جیسا کہا گیا ہے ؎

کشتگانِ خنجر تسلیم را ہر زمان از غیب جان دیگر ست (۲)

مگر خشک لوگ ان باتوں کو کیا جانیں ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست حال شیرانے کہ شمشیرِ بلا بر سر خورند (۳)

لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ آزاد لوگ بڑے عیش میں ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اُن کے ہر وقت بھالے (۴) لگتی ہیں غرض اپنے کام میں لگے رہو اپنے طرز میں فرق نہ ڈالو کوئی معتقد ہو یا نہ ہو اگر نہ ہوگا تو بلا سے۔ تم تو ایک سے تعلق کرلو باقی جھگڑا الگ کرو ؎

مصلحت دید من آن ست کہ یاران ہمہ کار بگذارند و خم طرہ یارے گیرند (۵)

تم تو حالت فقر میں بھی دل سے غنی رہو اور تمہارے پاس کچھ نہ ہو تب بھی بادشاہ رہو حافظ شیرازی نے خوب فرمایا ہے ؎

مبیں حقیر گدایان عشق را کیں قوم شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند

گدائے می کدہ ام لیک وقت مستی بیں کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم (۶)

ارے بھائی اگر چند لوگ بھی ہوجاویں گے تو فکر کیوں کرتے ہو اہل سماوات پر حکومت کرو گے۔

اللہ کے ہوجاؤ

اور اصل تو یہ ہے کہ ایک قصہ سناتا ہوں اس کو سن کر اس کو اپنا مذہب بنالو۔

(۱) وقتی کیفیت (۲) خشیت ربانی سے اپنا سر جھکا دینے والوں کو ہر گھڑی ایک نئی زندگی غیب سے عطا ہوتی ہے (۳) ''تیرے پاؤں میں کبھی کانٹا بھی نہیں چبھا تجھے ان لوگوں کی تکلیف کا کیا احساس ہوگا جو اپنے سروں پر مصیبتوں کی تلواریں کھاتے ہیں (۴) نیزہ (۵) ''میرے نزدیک مصلحت یہ ہے کہ یار لوگ تمام کاموں کو چھوڑ کر محبوب حقیقی کے تصور میں لگ جائیں'' (۶) ''گدایان عشق کو حقیر مت سمجھو یہ لوگ تخت و تاج کے بادشاہ ہیں۔ میں گدائے میکدہ ہوں مگر مستی کے وقت دیکھ کہ فلک پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں''۔

قصہ یہ ہے کہ ہارون رشید نے جشن کیا تھا اور یہ کہدیا تھا جس کو جو چیز پسند ہو اُس پر ہاتھ رکھدے وہ اُسی کی ہوجاویگی ایک لونڈی نے خود ہارون رشید پر ہاتھ رکھدیا اُنہوں نے عتاب آمیز لہجہ میں اس گستاخی کا سبب دریافت کیا تو جواب دیا کہ میں جو چیز بھی لیتی وہی ایک میری ہوجاتی اس لئے میں نے آپ کولیا تا کہ سب چیزیں میری ہوجاویں خلیفہ نے اس جواب کو بہت پسند کیا اور اُس لونڈی کو اپنے خواص میں داخل کرلیا صاحبو وہ تھی لونڈی مگر بات کتنی سمجھ کی کہی۔ صاحبو! اسی طرح اُس ذات پاک کو کیوں نہیں لیتے کہ جس کے لینے سے سب تمہارے ہوجاویں نیز مشاہدہ ہے کہ جتنے روکھے بزرگ ہوتے ہیں اُن کو لوگ زیادہ لپٹتے ہیں حتی کہ مجذوب تو بالکل ہی روکھے ہوتے ہیں لوگ ان کو بے حد لپٹتے ہیں۔ مجذوب گالیاں دیکر نکالتے ہیں۔ اور لوگ خوش ہوکر پاؤں پر گرتے ہیں بلکہ اگر وہ نرمی کرنے لگیں تو کہتے ہیں کہ جب شاہ صاحب سخت تھے تو کام ہوجایا کرتا تھا اب نرم بن گئے اس لئے کام نہیں ہوتا پس اس سے معلوم ہوا کہ دنیاداروں کی چاپلوسی کی جو ضرورت گھڑ رکھی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ ہاں مخلوق سے قطع تعلق میں یہ نیت نہ کرنا چاہئے کہ اس ترکیب سے لوگ متوجہ ہوں گے اگر یہ نیت کرلو گے تو نہ یہ مقصود حاصل ہوگا نہ مقصود اصلی یعنی تعلق مع اللہ کیونکہ سب کچھ خدا کے حکم سے ہوتا ہے اور وہ نیت کو جانتا ہے نری تدابیر سے کام نہیں ہوتا اس کی مشیت کی ضرورت ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسا بالغ قدرت سے ہوتا ہے اگر کوئی شخص کسی کم سن بچے کو مقویات کھلاوے تو اس سے کیا ہوتا ہے بلوغ تو اپنے وقت پر مشیت ایزدی(۱) سے ہوگا۔ اسی طرح یہ بلوغ باطنی بھی قدرت سے ہوتا ہے اور واقع میں حقیقی بلوغ یہی ہے جیسا کہ فرمایا ہے ؎

خلق اطفال اند جز مست خدا نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا(۲)

(۱) اللہ کے چاہنے سے (۲) ''سوائے عارف باللہ کے کوئی بالغ نہیں ہے جو خواہشات نفسانی میں محبوس ہے وہ ابھی نابالغ ہے''۔

بس اس کی فکر کرو کہ تعلق مع اللہ نصیب ہوجاوے اس سے بالغ ہوجاؤ گے پھر غالب ہوجاؤ گے عوام کے مذاق کے تابع نہ بنو مثلاً اگر کوئی شخص داڑھی رکھنے کا حکم قرآن سے مانگے تو صاف کہدو کہ یہ حکم قرآن شریف میں نہیں ہے۔ حدیث شریف میں ہے بھلا چاہتے ہوتو مانو ورنہ دوزخ میں جاؤ اور میں جو حکمتیں بیان کررہا ہوں یہ تبرع ہے۔ میں مسا ولد وغیرہ کے متعلق جواب دے رہا تھا کہ قسم میں ان کی تخصیص کیوں کی گئی سو قاعدہ مذکورہ پر اصل جواب تو یہی ہے کہ اس سوال کا حق نہیں ہے مگر تبرعاً کہدیا کہ یہ چیزیں اکثر پیش نظر رہتی ہیں اس لئے سہولت کے لئے یہ تخصیص کی گئی اسی پر یہ بحث طویل ہوگئی۔

انسان کی حماقت

اب میں مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ یہاں تک قسم کا بیان ختم ہوگیا اب قسم کے بعد مُقْسَم علیہ یعنی جواب قسم کا بیان ہے ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ ﴾(۱) یعنی انسان کو ہم نے بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے، حاصل یہ ہوا کہ اس پر سختیاں گذرتی ہیں اور اس کا اثر یہ ہونا چاہئے تھا کہ اتباع کرتا۔ مگر اتنے واقعات ہورہے ہیں اور وہ کچھ خیال نہیں کرتا چمار کی طرح کہ اگر اس کو کوئی مارے تو کہتا ہے اب کے مار۔ آگے ارشاد ہے: ﴿اَیَحْسَبُ اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْهِ اَحَدٌ ﴾(۲) کیا اس کا اب بھی یہی خیال ہے کہ میں کسی کا ماتحت نہیں ہوں گا اول تو یہی سمجھنا حماقت ہے کہ اس پر کسی کو قدرت نہیں ہے لیکن آئندہ کسی کی قدرت ہونے کا انکار تو بہت ہی کھلی ہوئی حماقت ہے کیونکہ مستقبل کی تو کسی کو کچھ بھی خبر نہیں۔ حق تعالیٰ نے مستقبل کی نفی پر نکیر فرمائی تاکہ اشد درجہ کی حماقت انسان کی ثابت ہوکیا ٹھکانا ہے بلاغت کا۔ آگے اسکا بیان ہے کہ اخلال علمی کے ساتھ اخلال عملی میں بھی مبتلا ہے:

(۱) سورۃ البلد: ۹۰/۴ (۲) سورۃ البلد: ۹۰/۵۔

﴿یَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا﴾(۱) یعنی عجز و نیاز بھول گیا اور از راہ تکبر کہتا ہے کہ میں نے بہت سا مال خرچ کر ڈالا اور انفقت نہیں فرمایا کیونکہ انفاق منفعت میں ہوتا ہے اور اہلاک بلا فائدہ خرچ کرنے کو بھی کہتے ہیں پس اس میں ایک دقیق لطیفہ ہے کہ اَهْلَكْتُ کہہ کر اپنے خسارہ کا خود اقرار کر لیا تو گویا یہ فرماتے ہیں کہ رسول کی مخالفت میں جو خرچ کیا گیا وہ بالکل ضائع ہے پس اَهْلَكْتُ کے لفظ میں اس کو اقراری مجرم بتانا ہے یہ ایک طرز ہے کہ جس سے مخاطب اپنا جرم مان لے اس لئے صراحۃً مخالفت حق میں خرچ کرنے کو بیان نہیں کیا ایسا کہنے سے وہ اس کا انکار کرتا بلکہ اَهْلَكْتُ کے اقرار سے لطیف اشارہ کر دیا۔ کیونکہ ملزوم کا اقرار لازم کا اقرار ہے آگے فرماتے ہیں ﴿اَیَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَهٗۤ اَحَدٌ﴾(۲) کیا وہ انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں۔ یہاں تک شکایت کا حاصل یہ ہوا کہ انسان کو نعم اور تکالیف سے تنبہ نہیں ہوا۔

علمی نکتہ

آگے نعمتیں یاد دلاتے ہیں کہ معلوم ہو کہ اس کو نعم سے بھی تنبہ نہیں ہوا پس ارشاد فرماتے ہیں: ﴿اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَیْنِ وَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ﴾(۳) اس استفہام میں نکیر شدید ہے ان نعمتوں کے بھلا دینے پر اور یہی آیت اس وقت مقصود بالبیان ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ مقصود مطول ہو(۴)۔ اور اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ کیا ہم نے اُس (انسان) کے واسطے دو آنکھیں نہیں بنائیں اور کیا ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے اور اس کو دو راستے نہیں بتلائے اور دو راستوں سے مراد خیر و شر ہیں۔ سو خیر تو اس لئے بتلائی کہ اس کو اختیار کیا جاوے اور شر اس واسطے بتلا دیا کہ اس سے پرہیز کیا جاوے۔ پس شر کا بتلانا بھی

(۱) سورۃ البلد: ۹۰/ ۶ (۲) البلد: ۹۰/ ۷ (۳) البلد: ۹۰/ ۸۔۱۰ (۴) مقصود لمبا ہو۔

نعمت ہے وبضدھا تتبین الاشیاء (۱) اور یہ تو بعد میں بتلاؤں گا کہ آیت میں کن کن نعمتوں کا بیان ہے پہلے یہ سمجھو کہ حق تعالیٰ نے سمع وبصر کو کہیں تو مفرد کے صیغوں سے بیان فرمایا ہے یعنی سمع وبصر اور کہیں جمع کے صیغوں سے یعنی ابصار وآذان بہرحال تثنیہ کہیں نہیں فرمایا گیا بجز اس جگہ کے سو اس میں کیا نکتہ ہے واللہ اعلم بحقیقۃ الحال (۲) مگر میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ مخاطب غبی کو خاص تنبیہ کردی کہ آنکھ دی اور ایک پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دو عنایت کی ہیں اور دوسرا نکتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اشارہ ہو ایک مسئلہ طبعیہ کی طرف قرآن شریف کی یہ شان ہے ؎

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد
برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را (۳)

وہ مسئلہ یہ ہے کہ دو ہیں مگر بمنزلہ ایک کے کیونکہ دونوں آنکھیں ایک وقت میں ایک ہی چیز کو دیکھ سکتی ہیں ایسے ہی شفتین کہ دونوں سے ایک ہی کلام ہوسکتا ہے یہ نہیں کہ ایک آنکھ سے ایک چیز کو دیکھ لیں اور دوسری سے دوسری کو یا ایک ہونٹ سے ایک بات کرتے ہیں اور دوسرے سے دوسری بات کرنے لگیں۔ اور کوئی یہ نہ کہے کہ تم تو قرآن شریف میں حکمۃ طبعیہ کے مسائل نکالنے سے منع کیا کرتے ہو بات یہ ہے کہ قرآن شریف میں حکمت کے مسائل مقصود نہیں باقی کہیں نکل آویں تو اُس سے مجھ کو انکار نہیں البتہ الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ (۴) کا لحاظ ضروری امر ہے یہ تو نکتہ تثنیہ کا ہوا اس آیت میں۔

دوسرا نکتہ

ایک دوسری آیت میں ایک اور نکتہ بیان کرتا ہوں۔ ارشاد فرمایا ہے:

(۱) ضدوں سے اشیاء پہچانی جاتی ہیں (۲) حقیقت کا علم تو اللہ ہی کو ہے (۳) ''اس کے عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل وجان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل وجان کو بُو سے تازہ رکھتی ہے'' (۴) ضروری کو بقدر ضرورت ہی استعمال کرنا چاہئے۔

﴿وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ﴾(۱) اس میں ابصار وافتدہ کو جمع لایا گیا ہے اور سمع کو مفرد مولانا محمد یقعوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ سمع ایسی چیز ہے کہ بہت سے سننے والے ایکدم سنتے ہیں۔ اس لئے وہ سب ملکر مثل ایک کے ہیں۔ مجلس واحد میں عادۃً یہی ہوتا ہے کہ سب ایکدم سنیں یہ نہیں کہ علی التعاقب سنیں(۲) تو گویا سب اسماع جمع ہوکر سمع واحد(۳) کے حکم میں ہیں اور ابصار میں تعاقب ہوسکتا ہے اسی طرح قلوب کے فہم میں بھی تعاقب ہوتا ہے خلاصہ یہ کہ ادراک سمع کا واحد تھا اس لئے سمع کو مفرد لائے بخلاف ابصار وقلوب کے کہ اُن کا ادراک علی التعاقب جدا ہوسکتا ہے(۴) اور اس نکتہ کی ضرورت اُس مقام پر ہوگی کہ ابصار وقلوب بدون اضافت الی ضمیر الجمع(۵) آیا ہو ورنہ اضافت الی ضمیر الجمع کے وقت تو بوجہ مقابلہ جمع بالجمع کے ابصار وقلوب بھی حکم مفرد میں ہوجاوینگے۔

تیسرا نکتہ

اب ایک نکتہ اور بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ (۶) میں قلب اور سمع کے لئے ختم لائے اور بصر کے واسطے غشاوۃ لائے اس میں بھی ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ قلوب اور سمع کا ادراک کسی ایک جانب کے ساتھ خاص نہیں تو ان کے ابطال ادراک کے لئے سب جوانب سے موانع کے احاطہ کی ضرورت ہے اور ختم میں ایسا ہی احاطہ ہوتا ہے جو سب جوانب سے مانع ہوتا ہے بخلاف بصر کے کہ اُسکا ادراک صرف جہۃ مقابلہ سے ہوتا ہے سو اس کے مانع کا بھی ایک جانب سے ہونا کافی ہے اور غشاوہ ایک ہی جانب ہوتا ہے۔ اس لئے فرمایا خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ (۷) یعنی اُن کے دلوں اور کانوں پر

(۱) النحل:۱۶/۷۸ (۲) یکے بعد دیگرے (۳) سب کا سننا ایک کے سننے کی مانند ہوگیا (۴) یکے بعد دیگرے ہوسکتا ہے (۵) ضمیر جمع کی طرف اضافت نہ ہو (۶) البقرۃ، الآیۃ:۲/۷ (۷) البقرۃ:۲/۷۔

مہر کردی وَعَلٰٓی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ یعنی ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور یہ نکتہ جب ہے کہ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ کا عطف عَلٰی قُلُوْبِھِمْ پر ہو اور بعض مفسرین وَعَلٰی سَمْعِھِمْ کا عطف عَلٰی قُلُوْبِھِمْ پر نہیں کرتے بلکہ اس کو معطوف علیہ قرار دیتے ہیں وَعَلٰٓی اَبْصَارِھِمْ کا۔ تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ سمع وبصر دونوں پر پردہ ڈالا گیا ہے اور مجھے یاد نہیں کہ اس جگہ عطف میں کیوں اختلاف ہوا ہے میرے نزدیک تو شق اول متعین ہے کیونکہ دوسری جگہ احتمال اول کی تصریح ہے وَ خَتَمَ عَلٰی سَمْعِہٖ وَقَلْبِہٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشٰوَۃً (۱) پس جب وہ وجہ محتمل ہی نہیں تو میں اس کی توجیہ میں دماغ کیوں تھکاؤں ناحق کے نکتے اچھے نہیں معلوم ہوتے۔

بے محل سوال

ورنہ پھر امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد کی مثال صادق آویگی کہ اُنکا ایک شاگرد خاموش بیٹھا رہتا تھا انہوں نے فرمایا تم بھی کوئی سوال کیا کرو اُس نے کہا بہت اچھا اب سے کیا کروں گا اس کے بعد جو سبق پڑھنے بیٹھے تو یہ حدیث آئی کہ جب آفتاب غروب ہوجاوے تو فوراً روزہ افطار کرلیا کرو۔ آپ نے دریافت کیا کہ اگر کسی روز آفتاب غروب نہ ہو تو کیا کریں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا بھائی تم خاموش ہی رہا کرو اور اگر کوئی احتمال کی بناء پر سوال کرے اور کہے کہ آخر اسکا احتمال تو ہے ہی کہ عَلٰی سَمْعِھِمْ کا عطف عَلٰی قُلُوْبِھِمْ پر ہو تو میں کہوں گا کہ ایسے احتمالات کا اعتبار نہیں ہے۔ کیا قرآن شریف دوبارہ نازل ہوگا جب دوسری جگہ قرآن شریف میں صراحتاً وَ خَتَمَ عَلٰی سَمْعِہٖ وَقَلْبِہٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشٰوَۃً موجود ہے تو پھر اس جگہ بھی اس کے مطابق توجیہ کیوں نہ کی جاوے۔

(۱) الجاثیۃ: ۲۳۔

مدرکات ثلاثہ

اب اسکا بیان کرتا ہوں کہ اس آیت میں ان مدرکات ثلاثہ میں سے کن مدرکات کا بیان ہے۔ سو اول نظر میں تو معلوم ہوتا ہے کہ فقط ایک مدرک کا بیان ہے یعنی فقط بصر کا ذکر ہے مگر بعد تامل معلوم ہوتا ہے کہ دو کا ذکر ہے ایک بصر کا عینین میں دوسرے قلب کا گو اسکا ذکر منطوقاً(۱) نہیں کیا ہے مگر وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ میں مفہوماً ذکر کر دیا پس هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ میں نعمت قلب کا تذکرہ ہے کیونکہ یہ فعل قلب کا ہے۔ قلب ہی سے تو ہدایت کا ادراک ہوتا ہے اور یہی قلب مخاطب ہے امر و نہی کا اور یہی مدرک ہے کلیات و جزئیات کا گو بواسطہ آلات سہی اور وہ آلات عقل و حواس ہیں ظاہرہ بھی باطنہ بھی اور یہی قلب حافظ ہے کلیات و جزئیات مدرکہ کا۔ ظواہر نصوص سے یہی مفہوم ہوتا ہے اور گو یہ حکماء کے خلاف ہے کہ انہوں نے اختلاف مدرَکات (بصیغۃ المفعول) سے خود مدرِکات (بصیغۃ الفاعل) میں بھی اختلاف کا دعویٰ کیا ہے کلیات کے لئے عقل اور جزئیات کے لئے حواس۔ پھر مختلف مدرکات کے لئے حافظات بھی جدا جدا مانے ہیں مگر متکلمین کو یہ مضر نہیں کیونکہ یہ قول حکماء کا سب بناء الفاسد علی الفاسد ہے(۲) کیونکہ اس تغایر کی ضرورت اُن کو الواحد لا یصدر عنہ الواحد (۳) کی وجہ سے ہوئی ہے جیسا کتب فلسفہ میں مشہور ہے اور یہ قاعدہ خود غلط ہے اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ و نیز اس قاعدہ میں خود حکماء نے تصریح کی ہے کہ یہ قاعدہ واحد حقیقی کے متعلق ہے اور قُوی مدرِکہ کی وحدت حقیقیہ خود باطل ہے۔ نہ معلوم یہ حکماء کہاں چلے جاتے ہیں اصل مسئلہ میں تو واحد کے ساتھ حقیقی کی قید لگاتے ہیں اور تحقیق فروع کے وقت اس قید کا خیال نہیں کیا جاتا کتنی بڑی غلطی ہے۔ یہ تو ایسا ہوا کہ ہجے کئے تبّت کے اور رواں پڑھا بطخ۔ البتہ آلات اور ان کے تغایر کا دعویٰ صحیح ہے جس کی سیدھی ''دلیلِ انّی'' مشاہدہ ہے مگر حکماء نے

(۱) اسکو لفظاً ذکر نہیں کیا (۲) ایک غلط بات پر بنیاد رکھنا ہے (۳) ایک فرد سے ایک ہی بات کا صدور ہو سکتا ہے۔

''دلیلِ لمی'' بیان کرنا چاہا اور مدرک (بالفتح) مختلف پائے گئے اس لئے قاعدہ مذکورہ کی بناء پر مختلف مُدرِکات کی ضرورت پڑی۔ پھر جن جن مدرکات میں قابلیت جس جس کے ادراک کی سمجھے ایک ایک ادراک کو اُن کے سپرد کردیا جن میں سب مدرکات (بالفتح) حسیہ تو ادراکاً وحفظاً حواس کے متعلق ہوگئے مگر مدرکات کلیہ باقی رہ گئے اُنکا مدرک عقل کو تجویز کیا مگر کوئی حافظ ان کلیات کا نہیں ملا تو عقلی گھوڑے دوڑائے اور عقل فعال کا نام لے دیا اور کوئی نہ تھا تو عقل فعال کو کھینچ لائے۔ جیسا کہ ہمارے مدرسہ کے ایک طالب علم عید وشاہ کا قصہ ہے وہ بہت بھولے طالب علم تھے میں نے ایک مہمان سے اُن کے کچھ واقعات ظاہر کرکے کہا کہ یہ بہت سیدھا آدمی ہے اُن کو تعجب ہوا میں نے اُن کو مشاہدہ کرانے کے لئے اُن کے سامنے ہی پکارا اور کہا عید وشاہ، بلا لاؤ وہ دوڑے۔ میں نے بلا کر پوچھا کس کو بلانے جاؤ گے کہا مولوی عبداللہ صاحب کو میں نے کہا تم نے کیسے سمجھا کہ میں اُن کو بلا رہا ہوں جواب دیا کہ آپ اکثر ان کو بلایا کرتے ہیں۔ میں نے کہا تمہیں چاہئے تھا کہ تم مجھ سے پوچھتے کہ کس کو بلاؤں اور پھر بُلانا چاہئے تھا۔ یہ سب کچھ کہنے کے بعد میں نے کہا اچھا جاؤ بلالاؤ وہ پھر چلدیئے اور مجھ سے پھر بھی نہ پوچھا میرے سوال پر پھر بھی کہا کہ مولوی صاحب کو بلا کر لاتا ہوں بس عید وشاہ کے نزدیک جب کسی کو بلایا جاوے تو مولوی عبداللہ صاحب مراد ہوتے تھے اسی طرح حکماء کے ذہن میں کسی کام کے لئے جب کوئی نہ ملے وہاں عقل فعال کو مان لیتے ہیں جیسے یہاں حفظ کلیات کے لئے اس کو تجویز کیا اور جیسے تدبیر عالم عنصری کے لئے اس کو تجویز کیا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ چونکہ اس کام کا سلسلہ دواماً جاری ہے(۱) اس لئے اس کام کے واسطے کوئی مستمر چیز (۲) ہونی چاہئے اور اشیاء مستمرہ میں سے فلک میں تو علوم کی استعداد نہیں (۳) اور خدا تو اُن کے نزدیک عقل اول کو پیدا کرکے (نعوذ باللہ) معطل ہوگیا(۴) اور دوسرے عقول کے افعال منکشف نہیں ہوسکتے (۵)

(۱) ہمیشہ سے جاری ہے (۲) کوئی ایسی بات ہو جو ہمیشہ سے ہو (۳) پہلے سے موجود چیزوں میں آسمان میں تو علم حاصل کرنے کی استعداد نہیں (۴) پہلی عقل کو پیدا کرنے کے بعد بیکار بیٹھا ہے (۵) دوسری عقول میں کثیر افعال پائے نہیں جاتے۔

بس عقل فعال (۱) ہی ایسی چیز رہ گئی کہ اس حفظ کلیات کے بار کو اُٹھا سکے اس لئے اُس کے ذمہ ڈالدیا جیسے عمرو عیار کی زنبیل تھی (۲) کہ اُس میں سب کچھ سما جاتا تھا۔

اسی طرح حکماء کی عقل فعال ہے کہ اس میں ہر شے کی کھپت ہے (۳) حکماء کی اس غلطی کے ساتھ ان کی ایک اور مشہور مسئلہ کے متعلق غلطی بیان کرتا ہوں۔

حکماء کی پریشانی

حکماء کہتے ہیں کہ محدد جہات (۴) کے بعد نہ خَلا ہے نہ مَلا (۵) ہے ظاہر بات ہے کہ ارتفاع نقیضین محال ہے پھر یہ حکم لاخلا ولا مَلا کا کیسے صحیح ہوسکتا ہے اگر وہاں خلا وملا دونوں نہیں تو اور کون چیز ہے۔ دراصل قدماء اتنے بیوقوف نہ تھے جو ایسے امر محال کے قائل ہوتے اس قول کو متاخرین نے بگاڑا ہے متقدمین کی یہ غرض نہ تھی بلکہ انہوں نے حکم کی نفی کی ہے تحقق کی نفی نہیں کی تھی۔ مطلب یہ تھا لانحکم بخلاء ولا بملاء لانتفاء الدلیل (۶) اور اس میں کوئی خرابی نہ تھی یہ متاخرین کی عقلمندی ہے کہ نفی حکم سے نفی تحقق سمجھ بیٹھے یہ مشائین (۷) تو بالکل ہی عقل سے کورے ہیں۔ غرض حکماء مدرَکات ومدرِکات کی تفصیل میں کتنے پریشان ہوئے اور ہم کو کتنی آسانی ہوگئی کہ جس کا مشاہدہ ہوا اس کے قائل ہوگئے۔ مثلاً کہدیا کہ دیکھنے کی چیز آنکھ سے مدرَک ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ یہ تو مشاہدات کا فیصلہ ہوگیا۔ باقی رہے معانی جو مشاہد نہیں سو اس میں عقلی احتمالات بہت تھے کوئی ممتنع نہ تھا مگر تعیین کے لئے نقل کی ضرورت ہے چونکہ قرآن نے ادراک معانی کے مواقع پر قلب کا ذکر کیا ہے چنانچہ ارشاد ہے: اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ الآیہ (۸) اس واسطے قلب کو مدرِک معانی کہدیا گو بواسطہ عقل سہی اور اسی طرح هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ میں قلب کا ذکر

(۱) ایک عقل کام کرنے والی ہی ایسی باقی بچی کہ جس کے ذمہ کلیات کی حفاظت لگادی جائے (۲) جیسے عمرو عیار کا تھیلہ تھا کہ اس میں سب کچھ سما جاتا تھا (۳) اسی طرح عقل فعال ہے کہ اس میں سب کچھ آجاتا ہے (۴) جہات کی انتہاء کے بعد (۵) بھری ہوئی جگہ (۶) ہم نہ خلاء کا حکم لگاتے ہیں نہ ملا کا کیونکہ اس پر کوئی دلیل نہیں (۷) حکماء متاخرین (۸) سورہ ق: ۵/۳۷۔

ہے۔ سو متبع قرآن کو کتنی آسانی ہے اور جو عقلی گھوڑے دوڑاتے ہیں ان کو سخت مشکلیں پیش آتی ہیں جن کی ضرورت نہ تھی چنانچہ حکماء نے جو مدرِک اور حافظہ کو الگ قرار دیا ہے مثلاً اس کی بھی ضرورت نہیں ہے ہم کہتے ہیں کہ جو مدرِک ہو اگر وہی حافظ ہو تو کیا خرابی ہے اور ہم نے جو یہ کہا ہے کہ قلب مدرک ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم آلات کا انکار کرتے ہیں البتہ ان آلات کا فاعل ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں اور حکماء جو ان آلات کی فاعلیت پر دلیل بیان کرتے ہیں کہ مثلاً سر میں چوٹ لگنے سے بعض ادراکات میں فرق آجاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ قوت ان آلات میں ہے نہ کہ قلب میں یہ دلیل صحیح نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے کہ صحت دماغ شرط ہو ادراک قلب کی تو اس سے اُن آلات کا مدرِک ہونا ثابت نہیں ہوتا بفضلہٖ تعالیٰ ان آیات کی تفسیری تحقیق تو بقدر ضرورت ہو چکی۔

آنکھ قدرت خداوندی کا مظہر

اب میں خاص حاسہ بصر کے متعلق جو اس وقت خصوصیت کے ساتھ مقصود بالذکر ہے بعض ضروری مضامین بیان کر کے پھر وعظ کا خلاصہ بیان کر کے تقریر کو ختم کردوں گا سو حاسہ بصر (۱) کے متعلق ایک مضمون تو یہ ہے کہ آنکھ کی بھی عجیب بناوٹ ہے خدا نے ایک نہر پیدا کی ہے اور دماغی تجویف (۲) میں نور بھرا ہوا ہے جو آنکھوں میں آتا ہے اس میں سب مبصرات منتقش (۳) ہو جاتے ہیں جب اس تجویف (۴) میں کوئی خرابی آجاتی ہے تو دماغ سے وہ نور آنا بند ہو جاتا ہے۔ اس لئے عبرت چاہئے کہ اس آنکھ سے خدا کی نافرمانی کرتے ہیں اس کی ہی عطا کی ہوئی چیز اور اُسی کے مقابلہ میں صرف کی جاوے یہ خیال نہیں کرتے کہ اگر وہ اس نعمت کو چھین لیں تو کیا ہوگا ایک ملحد کی حکایت ہے کہ اُس نے یہ آیت: ﴿ قُلْ اَرَءَيْتُمْ

(۱) بینائی (۲) جوف دماغ میں (۳) سب نظر آنے والی چیزوں کا نقش (۴) جوف دماغ میں۔

اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴾(۱) سنکر گستاخی کی اور کہا نأتی بہ بالمعول والمعین یعنی اگر پانی نیچے اُتر جاوے تو کدال اور مزدور کے ذریعہ سے کھود کر نکال لیں گے۔ اس کو خواب میں سزا دی گئی کہ اُس کی آنکھیں چھین لیں اور کہا گیا کہ ہم نے تیری آنکھوں کا پانی چھین لیا اس کو معول ومعین یعنی کدال ومزدور کی مدد سے واپس لے آ۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ گستاخی کرنا معمولی بات نہیں ہے حق تعالیٰ نے اُسی وقت اس کی گستاخی پر مواخذہ کیا کہ تو کنویں کے پانی نکالنے کا دعویٰ کرتا ہے ذرا اپنی آنکھوں کا تو پانی نکال لے جس کی زیادہ گہرائی بھی نہیں ہے، اور درحقیقت زمین ہی کھودنے میں کیا رکھا ہے اگر حق تعالیٰ زمین میں پانی پیدا نہ کریں تو کتنا ہی کھود لو کچھ بھی نہیں نکل سکتا سب چیزیں خدا ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں اور بعض مرتبہ اس قدرت کو ایسی طرح ظاہر کردیتے ہیں کہ انکار کی گنجائش ہی نہیں رہتی اور سوائے قدرت خداوندی کے اس میں کسی کے دخل کا احتمال ہی نہیں رہتا۔ گنگوہ کا قصہ ہے کہ ایام غدر (۲) میں ایک شخص کے کنپٹی میں گولی لگی اور اس کی طاقت ختم ہوچکی تھی اس لئے پار نہ جاسکی دماغ میں ''مجمع نور'' کے موقع پر بیٹھ گئی وہ شخص فوراً اندھا ہوگیا اب گولی کس طرح نکلے پار کس طرح کریں حق تعالیٰ شانہ کی ہستی ایسے واقعات سے بیّن (۳) طور پر معلوم ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ سب تو اسی سوچ میں تھے کہ کیا کریں دفعاً ایک گولی اور آئی اور عین اُسی جگہ کو ہوتی ہوئی پار ہوگئی اور پہلی گولی کو ساتھ لیتی گئی اور بینائی عود کر آئی۔ غیب سے علاج ہوگیا فقط زخم کی تکلیف باقی رہ گئی اس کا علاج کرلیا گیا یہ ترکیب کس سے ہوسکتی تھی اسی کو کہا گیا ہے ؎

در دم نہفتہ بہ زطبیبان مدعی باشد کہ از خزانہ غیبش دوا کند (۴)

اور امراض باطنی میں تو اکثر بلکہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ بے شان گمان

(۱) آپ کہہ دیجیے کہ اچھا یہ بتلاؤ کہ اگر تمہارا پانی نیچے کو غائب ہی ہوجاوے سو وہ کون ہے جو تمہارے پاس سوت کا پانی لے آئے۔ سورۃ الملک: ۶۷/۳۰ (۲) ایام بغاوت (۳) واضح طور پر (۲) ''ان بڑے بڑے دعویٰ کرنے والے طبیبوں سے میرا درد چھپائے رکھنا ہی اچھا ہے۔ انہیں چاہیئے کہ خزانہ غیب سے میری دوا کریں''۔

تدبیریں ہوتی رہتی ہیں مگر سمجھنے کے لئے اول ضرورت ہے کہ صحبت اہل اللہ کی اختیار کی جاوے جس کی شان یہ ہے ؎

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند(۱)

اس کے بعد ہر وقت یہ دیکھو گے ؎

در دم نہفتہ بہ کہ طبیبان مدعی باشد کہ از خزانہ غیبش دوا کنند

مدعی طبیبوں سے خدا بچاوے ان سے دور رہنا لازم ہے لیکن سچے اور محقق معالج سے درد کو نہفتہ کرنا(۲) محمود نہیں اور خزانہ غیب کے مفہوم میں محقق بھی تو داخل ہے اور اسکا مل جانا بھی خزانہ غیب ہی سے دوا کرنا ہے اور بعض دفعہ ظاہری امراض میں بھی ایسا ہی ہوجاتا ہے جیسا کہ ایک واقعہ گولی کا گذر چکا ہے۔ اور ایک ایسا ہی واقعہ مولانا رومی نے مثنوی میں لکھا ہے کہ کسی بادشاہ کی ایک کنیزک (۳) بیمار ہوگئی تھی ہر چند دوا کی کچھ نفع نہیں ہوا اولیاء اللہ میں سے ایک صاحب تشریف لائے اور حال دیکھا ان سے پہلے کنیزک کی یہ حالت تھی ؎

ہر چہ کردند از علاج واز دوا رنج افزوں گشت وحاجت ناروا(۴)

آگے ان اہل اللہ کا مقولہ فرماتے ہیں ؎

گفت ہر دارو کہ ایشان کردہ اند آں عمارت نیست ویراں کردہ اند(۵)

بے خبر بودند از حال دروں استعیذ اللہ مما یفترون(۶)

اور تشخیص کے متعلق فرماتے ہیں ؎

دید از زاریش کو زار دل ست تن خوش ست اما گرفتاری دل ست(۷)

عاشقی پیدا ست از زاری دل نیست بیماری چو بیماری دل(۸)

(۱) ''یہ وہ لوگ ہیں جو ایک نظر سے مٹی کو کیمیا بنادیتے ہیں'' (۲) چھپانا (۳) باندی (۴) ''ہر قسم کی دواء وعلاج کر کے دیکھ لیا رنج بڑھتا گیا اور ضرورت پوری نہ ہوئی'' (۵) ہر دواء جو بطور علاج استعمال کی گئی اس نے اس عمارت یعنی جسم کو مزید خراب ہی کیا (۶) ''وہ طبیب اسکی اندرونی کیفیت سے بے خبر تھے میں ان کے اس افتراء سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں'' (۷) ''اس کی بیماری کی یہ تشخیص کی کہ اس کو جسمانی بیماری نہیں بلکہ یہ قلبی مریض ہے'' (۸) ''اس کا دل کسی کے عشق کی بیماری میں مبتلا ہے دل کی اس بیماری جیسی تو کوئی بیماری ہے نہیں''۔

اس کے بعد نبض پر ہاتھ رکھا دریافت کرنا شروع کیا یہ کنیزک کہاں کہاں بکی کہاں کہاں رہی اُس کا پورا حال بیان کیا گیا جب سمرقند کا نام آیا تو نبض میں تغیر عظیم پیدا ہوگیا معلوم ہوگیا کہ بس اسکا تعلق عشقی وہیں سے ہے پھر تدبیر نافع ہوئی۔ اور اس کی بھی ضرورت نہیں کہ کوئی بڑا ہی کامل طبیب ہو بلکہ وہ جس سے چاہیں کام لے لیں ۔

داد او را قابلیت شرط نیست بلکہ شرط قابلیت داد او است(۱)

اور ایک شعر جو اس کے خلاف ہے اور اس کو لوگ عام طور پر پڑھ دیتے ہیں اس کا اعتقاد جائز نہیں وہ یہ ہے ۔

نقصان ز قابل ست وگرنہ علی الدوام فیض سعادتش ہمہ کس را برابر ست (۲)

کیونکہ اس سے حق تعالیٰ کا علت موجبہ ہونا لازم آتا ہے حالانکہ انہوں نے اپنے اختیار سے سب کچھ دیا ہے اور برابر نہیں دیا بس یہ شعر بالکل غلط ہے اور بعض مضامین بعض درسیات میں بھی غلط ہیں۔ درسیات میں ہونے سے اُن کی صحت لازم نہیں آتی بس درسیات میں سے بعض مضامین قابل درس بمعنی خواندن ہیں(۳) اور بعض مضامین قابل درس بمعنی محو کردن ہیں (۴) مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ نے بھی عرفی پر اُس کے ایک شعر کی بناء پر کفر کا فتویٰ دیا ہے عرفی کہتا ہے ۔

تقدیر بیک ناقہ نشانید دو محمل سلمائے حدوث تو ولیلائے قدم را(۵)

کیونکہ اس میں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قِدم کا قائل ہوا ہے اور قِدم ذاتی وزمانی دونوں غیر اللہ کے لئے محال ہیں البتہ اگر قِدم اصطلاحی نہ مراد لیا جاوے تو صحیح ہے یعنی قدم سے مراد سب مخلوقات سے سابقیت لیا جاوے کیونکہ

(۱) ''عطاء الٰہی کے لئے قابلیت شرط نہیں بلکہ قابلیت کا ہونا بھی تو ان کی عطاء ہے'' (۲) انعامات میں کمی اسکی قابلیت کے بقدر ہے ورنہ سعادت کا فیض تو اس کی جانب سے سب برابر ہے'' (۳) پڑھنے کے قابل ہیں (۴) مٹانے کے قابل (۵) ''تقدیر نے آپ کے وجود کو دو لباس پہنائے ہیں کہ وہ حادث بھی ہے اور قدیم بھی کہ روح سب سے پہلے پیدا کی گئی''۔

آپ کا نور اس معنی کر قدیم ہے یعنی باوجود حدوث کے سب محدِثات سے سابق ہے اور مخلوق ہونے کے اعتبار سے اصطلاحی معنی کے موافق آپ میں حدوث کی صفت ہے اور گو یہ تاویل کرنے کے بعد عرفی کی تکفیر نہیں ہوسکتی مگر مولانا نے فرطِ جوش یا انتظام کی وجہ سے فتویٰ دیدیا ہوگا اور میں نے مولانا کا فتویٰ دیکھا نہیں سنا ہے نہ معلوم انتساب کیسا ہے اگر انتساب ثابت ہوجاوے تو یہی تاویلِ انتظام یا فرطِ جوش کی کی جائے گی کیونکہ عام طور سے سننے والے اصطلاحی ہی قِدم سمجھیں گے۔ غرض استعداد بھی انہیں کی دی ہوئی ہے، استعداد کیا کسی اور کی دی ہوئی ہے جو یہ کہا جاوے ؎

نقصان ز قابل ست وگرنہ علی الدوام فیض سعادتش ہمہ کس را برابر ست (۱)

اور اس عطا شدہ استعداد پر بھی ناز نہ کرے یہ اُن کی عنایت ہے بقول شاعر ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل نسیم صبح تیری مہربانی

سو اصل علت تو اُن کی عطاء ہے باقی بعض مصالح کی بنا پر کچھ ظاہری اسباب بنادیئے ہیں جن کی طرف مجازاً نسبت کردی جاتی ہے جیسا کہا گیا ہے ؎

کار زلفِ تست مشک افشانی اماعاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند(۲)

موثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں

اور میں متعین کرتا ہوں کہ اسباب کی وہ مصلحت کیا ہے وہ تسلیہ (۳) ہے طباع ضعیفہ کا مثلاً کھانا پکنے کے لئے آگ پیدا کردی ہے ورنہ فکر میں پڑجاتے کہ کھانا کیسے پکے گا نفس کو بدون اسباب کے تسلی نہیں ہوتی اس مصلحت سے اسباب

(۱) ''یعنی قابل ہی کی جانب سے کمی ہے ورنہ اسکا فیض سعادت سب پر برابر ہے'' (۲) ''مشک بکھیرنا کام تو تمہاری ہی زلف کا ہے مگر عاشقوں نے ایک مصلحت سے چین کے ہرن پر تہمت رکھدی ہے'' (۳) کمزور طبیعتوں کے لئے باعث تسلی ہے۔

پیدا فرمادیئے ہیں ورنہ حقیقت میں وہی دینے والے ہیں اسباب کا کوئی مستقل دخل نہیں اسباب کا محض نام ہی ہے ۔

کارزلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

غلط فہمی کا ازالہ

اور جب اسباب کا درجہ معلوم ہوگیا تو یہاں سے غیر محقق واعظین کی ایک غلطی اور جہل ظاہر ہوگیا وہ یہ کہ یہ واعظین یوں کہا کرتے ہیں کہ لوگ باوجود وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱) فرمادینے کے بھی رزق کی طرف سے فکرمند رہتے ہیں اور کوئی دعوت کردے تو اُس پر بھروسہ کرکے مطمئن ہوجاتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کے وعدہ کو قابل اطمینان سمجھا اور حق تعالیٰ کے وعدہ کو قابل اطمینان نہ سمجھا اس نکتہ کو بیان کرکے بڑے خوش ہوتے ہیں مگر درحقیقت یہ مثال صحیح نہیں ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے وعدہ کے ساتھ سبب اور وقت، رزق (۲) کے لئے متعین نہیں کیا یعنی ہم کو اس کی تعیین کی اطلاع نہیں کی کہ فلاں وقت اور فلاں طریقہ سے اس قدر رزق تم کو ملے گا اور دعوت کرنے والے نے وقت مقرر کردیا ہے اگر خدا تعالیٰ بھی بتلادیتے کہ فلاں وقت کھانا ملا کریگا تو پھر کبھی بھی مسلمانوں کو تشویش (۳) نہ ہوتی اور اب جو تشویش ہے وہ مذموم نہیں ہے (۴) پس یہ تشویش دلیل عدم وثوق کی نہیں (۵) بلکہ اثر ہے خاصیت اسباب کا۔ جسکا درجہ اوپر مذکور ہی ہے بلکہ حقیقت میں یہ تشویش عین سنت اللہ پر عمل ہے کیونکہ وقت وسبب کے ابہام میں مباشرت اسباب کا اذن ہے (۶) مگر ان جاہل واعظوں نے فتویٰ ہی لگادیا افسوس ان جاہلوں کے ایسے ایسے نکتوں نے ناس کردیا۔

(۱) ''اور کوئی جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمے نہ ہو'' سورہ ھود:۶ (۲) کس ذریعہ سے اور کس وقت ملے گا (۳) پریشانی (۴) قابل مذمت نہیں (۵) بھروسہ نہ ہونے کی بناء پر نہیں ہے (۶) اسباب اختیار کرنے کی اجازت ہے۔

مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ وعظ کہنا دو شخصوں کا کام ہے ایک محقق کا اور ایک بے حیا کا اور اپنی نسبت فرماتے تھے کہ میں بے حیا ہوں اس لئے وعظ کہہ لیتا ہوں۔ اور صاحبو یہ تو آسان ہے کہ اظہار تواضع کے لئے ہر واعظ زبان سے کہدے مگر فرق یہ ہے کہ وہ بناوٹ سے ہوگا اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ بے بناوٹ کہتے تھے کیونکہ اُن کو کمالات حقیقیہ کا مبلغ(۱) معلوم تھا اس کے سامنے اپنے کمالات ہیچ نظر آتے تھے اور ہماری یہ حالت ہے ؎

چو آں کرمے کہ در سنگے نہان ست زمین و آسمان وے ہمان ست(۲)

اس لئے ہم آپ کو محقق سمجھتے ہیں اور اگر کوئی تواضع کا کلمہ منہ سے کہتے بھی ہیں تو دل اس کا ساتھ نہیں دیتا غرض یہ اسباب پر ناز نہ کرے کیونکہ خدا چاہے تو اسباب کو یا اثر اسباب کو چھین لے۔ اس کی قدرت غیر متناہی ہے(۳) مگر افسوس کہ ہم اسباب پر نظر کر کے بے فکر ہو جاتے ہیں اور بے فکری سے ہم عمر بھر نافرمانی کرتے ہیں ہم کو حقیقت پر نظر کر کے شرم کرنا چاہیئے کہ اُن کی عطا کردہ اشیاء کو اُن کی مخالفت میں صرف کیا جاوے۔ اگر لڑنا ہے تو اپنے گھر سے سامان لا کر لڑو۔ خدا کی دی ہوئی قوتیں اور اُن سے اُسی کی نافرمانی۔ غیرت نہیں آتی اگر نافرمانی ہی کرنی ہے تو خدا کی عطا کی ہوئی قوتوں سے کام نہ لو۔ دیکھیں تو بھلا اور کہاں سے لاؤ گے۔ واقعہ تو یہ ہے ؎

نیاوردم از خانہ چیزے نخست تو دادی ہمہ چیز و من چیز تست(۴)

(۱) حقیقت (۲) ''اس کیڑے کی مانند ہے جو پتھر میں چھپا ہو کہ اس کی زمین و آسمان تو وہ پتھر ہی ہے'' (۳) اللہ کی قدرت غیر محدود ہے (۴) ''میں اپنے گھر سے کوئی چیز نہیں لایا یہ سب آپ کا عطیہ ہے میری کیا حقیقت ہے میں بھی تو آپ کا ہوں''۔

آنکھیں بڑی نعمت ہیں

اور دوسرا مضمون حاسہ بصر (۱) کے متعلق باشتراکِ قلب کے یہ ہے کہ اس آیت میں دو مدرِکوں کا (۲) ذکر ہے اور دوسری آیتوں میں تین قُویٰ کا ذکر ہے جیسے ﴿ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ﴾ (۳) اور جیسے ﴿ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴾ (۴) اس سورۃ میں سمع کا ذکر نہیں ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اس مقام پر اُن چیزوں کا ذکر ہے جن کا وجود بیّن اور ظاہر ہے تاکہ شکایت میں قوت ہو اور کان کا حقیقت میں جو حاسہ ہے (۵) یعنی عصب خاص وہ خود صاحب سمع کو بھی مشاہد (۶) نہیں اور قلب گو مستور ہے (۷) مگر وہ اپنے جس مجموعی ہیئت سے مدرِک ہے (۸) وہ مشہور ہے۔ اور ممکن ہے کہ اور کوئی لطیفہ ہو ہماری سمجھ ہی کیا ہے اور تثنیہ کا نکتہ پیشتر بیان ہو چکا ہے۔ جہاں اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ کی تفسیر شروع ہوئی ہے جس کی تمہید میں یہ عبارت ہے کہ آگے نعمتیں یاد دلاتے ہیں۔ باقی عَيْنَيْنِ کی تقدیم کا نکتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس کے ادراک میں ایک خاص شان ہے کیونکہ اکثر افعال مشروط ہیں اِبصار (۹) کے ساتھ کھانا پینا چلنا پھرنا وغیرہ سب میں دیکھنے کی حاجت ہوتی ہے اس سے انسان ہر چیز کا صحیح اندازہ کر لیتا ہے بخلاف سمع کے (۱۰) اور قلب سے تو کوئی صاحب دل ہی پہچانتا ہوگا سب کو معلوم ہے کہ بہت کم افعال ایسے ہیں جن میں اِبصار کی حاجت نہ ہو (۱۱) یہ اور بات ہے کہ تجربہ کی وجہ سے بدوں اِبصار (۱۲) کام چل جاوے۔

---

(۱) بینائی کے بارے میں (۲) دو قوتوں کا ذکر ہے جن سے ادراک ہوتا ہے (۳) اللہ نے مہر لگادی ان کے دلوں اور کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے سورۃ البقرۃ:۲/۷ (۴) ''کان اور آنکھ اور دل ہر شخص سے اس سب کی پوچھ ہوگی'' سورۃ الاسراء:۱۷/۳۶ (۵) سننے والا پردہ (۶) سننے والا بھی اس کو نہیں دیکھتا (۷) دل اگرچہ پوشیدہ ہے (۸) اس کی قوت ادراکیہ مشہور ہے (۹) انسان کے اکثر افعال دیکھنے پر موقوف ہیں (۱۰) سننے کے (۱۱) جن میں دیکھنے کی ضرورت نہ ہو (۱۲) بغیر دیکھے۔

دوسری یہ کہ بصیر کو تنہائی میں وحشت نہیں ہوتی (۱) کیونکہ اِبصار میں مشغولی رہتی ہے (۲) کہ رنگ برنگ کی چیزیں دیکھتا رہتا ہے کبھی ادھر دیکھا کبھی اُدھر دیکھا پریشانی نہیں ہوتی بخلاف سمع (۳) کے کہ وہ اس وقت مشغول ہوسکتا ہے جبکہ دوسرا اس کے ساتھ ہو اور کلام بھی کرے اور قلب کے معلومات پرانے ہیں اس لئے ان میں بھی مشغولی نہیں ہوتی بس نشاط جتنا آنکھوں سے ہوتا ہے اتنا اور کسی شئی سے نہیں ہوتا۔

دو آنکھیں ہونے کی خوبی

پھر آنکھیں دو بنائیں کہ اس میں زینت ہے ورنہ ادراک ایک سے بھی ہوسکتا ہے دیکھو تو دو میں حُسن کیسا ہے اگر ایک طرف آنکھ ہوتی اور ایک طرف خالی جگہ ہوتی تو بدزیب ہوتی اور اگر بیچ میں ہوتی تو اول تو وہ بھی ایسی حسین نہ ہوتی۔ دوسرے یہ نفع کہاں ہوتا جو اَبْ ہے اگر ایک دُکھنے آجاوے تو دوسری سے دیکھ لو چنانچہ ایسا کم ہوتا ہے کہ دونوں آنکھیں ایک دم دُکھنے لگیں۔غرض آنکھ بڑی نعمت ہے اس کے بدون انسان سخت دشواری میں پڑجاتا ہے اسی واسطے تو حدیث شریف میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ من سلبت کریمتیہ فصبر عوضتہ الجنۃ او کماقال (۴) یعنی میں جس کی دو پیاری چیزیں یعنی آنکھیں لیلوں اور وہ صبر کرے اس کو عوض میں جنت دوں گا۔آنکھوں کے بغیر خاص شان کی تکلیف ہوتی ہے جبھی تو اس نابینائی کی حالت میں صبر کی اس قدر فضیلت ہے۔

تفہیم حدیث

اور حدیث میں عینین نہیں فرمایا کیونکہ کریمتین ہی سے سب سمجھ جاویں گے

(۱) آنکھوں والے کو تنہائی میں گھبراہٹ نہیں ہوتی (۲) دیکھنے میں مشغول رہتا ہے (۳) بخلاف قوت سماعت کے (۴) المعجم الکبیر، باب الجیم، جریر بن عبداللہ البجلی: رقم الحدیث:۲۲۶۳۔

یہ ایسی چیز ہے کہ نام کی ضرورت نہیں پیاری چیز کہنے سے خود بخود ہی ذہن میں آجاوے گی کیونکہ بعض وجوہ سے اس سے بڑھ کر کوئی نعمت پیاری نہیں پس کریمتین کے لفظ سے بھی اس نعمت کا دوسری نعمتوں سے بڑھ کر ہونا معلوم ہوگیا۔ ایسے امور میں محاورہ کی ضرورت ہے۔ منطق کافی نہیں ہے قرآن وحدیث میں لطف اسی کو آوے گا جس کو محاورات پر بھی عبور ہو اور اس حدیث سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ آنکھ بنوانے کی ممانعت ہے بلکہ جنت تو صبر کرنے سے مل چکی اب بنوالو گے تو اللہ میاں جنت چھین نہ لیں گے وہ ایسے کریم نہیں ان کی رحمت بہت بڑی وسیع ہے ہاں اگر تم آنکھ وغیرہ سے کام نہ لو اور خود جنت واپس دیدو تو اور بات ہے۔ پس آنکھ کی خصوصیت پر نظر کر کے اُس کو مقدم لایا گیا اور گو بعض اعتبار سے قلب آنکھ سے بڑھ کر ہے مگر اس جگہ مخاطب غبی ہے جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں کہ ایسے شخص کی شکایت مقصود ہے جو فہم ونہم (۱) سے متاثر نہیں ہوتا اس لئے ان خصوصیات پر نظر کی گئی جو زیادہ ظاہر ہیں۔

آنکھوں کی دوسری خوبی

اور دوسری یہ بات بھی ہے کہ بہت باتوں کے سمجھنے میں آنکھ سے مدد ملتی ہے اس وجہ سے اس کو ادراکِ قلب کا بھی موقوف علیہ کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَھُمْ کَیْفَ بَنَیْنٰھَا وَزَیَّنّٰھَا وَمَا لَھَا مِنْ فُرُوْجٍ (۲) دیکھئے اول نظر کا حکم دیا پھر بناء وتزئیں اور استحکام میں فکر کا حکم دیا (۳) اور یہاں معقولی نظر (۴) مراد نہیں ہے اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ تفسیر وحدیث کو معقول (۵) سے پہلے پڑھنا چاہئے ورنہ منقول کی اصطلاحات دماغ میں سمانے

(۱) مصیبتوں اور راحتوں (۲) ''کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر کی طرف آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسا بنایا اور اس کو آراستہ کیا اور اس میں کوئی رخنہ تک نہیں'' سورۂ ق: ۶/۵۰ (۳) اس کی بناوٹ خوبصورتی اور استحکام میں عزم کرنے کا حکم دیا (۴) منطقی نظر وفکر (۵) عقلی علوم حاصل کرنے سے پہلے سیکھے۔

کے بعد قرآن وحدیث سمجھ میں نہیں آتے۔ ایک معقولی طالب علم دیوبند میں نئے نئے آئے تھے پھرتے پھراتے میرے حجرہ میں پہنچے میں لکھ رہا تھا پوچھا کیا لکھ رہے ہو میں نے کہا تصور شیخ کا مسئلہ لکھ رہا ہوں آپ بولے شیخ بوعلی سینا بس اُن کے نزدیک بوعلی کے سوا کوئی شیخ ہی نہیں سب جولاہے ہی ہیں اور گویہ بات بعض منقولیوں میں بھی ہے جیسا کہ ایک مولوی صاحب نے قطبی میں قال الامام کا ترجمہ کیا تھا امام ابوحنیفہ نے فرمایا۔ مگر یہ مضر تو نہیں بے قطبی بھی انسان قطب بن سکتا ہے اور جس کو دینیات نہ آویں نری معقول ہی آئی ہو تو وہ معقول نہیں عصف ماکول ہے(۱)۔

آنکھوں کی سب سے بڑی خوبی

اور تیسرا مضمون یہ ہے کہ آنکھ کی ایک خصوصیت اور ذہن میں آئی وہ یہ کہ سب سے بڑی نعمت یعنی دیدار خداوندی کا ادراک اسی سے ہوگا (یہ خصوصیت حضرت والا نے وعظ کے بعد ارشاد فرمائی تھی اس لئے مختصر لفظوں میں لکھی گئی اگر اثنائے وعظ میں اس کا تذکرہ ہوتا تو غالباً مبسوط ہوتا اس کی خصوصیت میں مستقل بیان ہوسکتا۔ ہم کو چاہئے کہ آنکھوں کی قدر کریں اور جن آنکھوں سے نعمت دیدار کے متمنی ہیں ان سے ممنوعات کو نہ دیکھیں ۱۲ جامع)(۲)

بینائی پر شکر کا طریقہ

خلاصہ یہ کہ آنکھ بنوانے کا تو مضائقہ نہیں ہے مگر اُس سے کام لینا چاہئے اگر کام نہ لیا تو کیا نفع ہوا یہ بینائی کس کام کی جب کام نہ لیا تو گویا اندھا ہی ہے بلکہ اصل میں نابینا وہی ہے جو آنکھوں سے کام نہ لے چنانچہ حق تعالیٰ کام نہ لینے والوں کی بابت بطور شکایت فرماتے ہیں صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ(۳) اور اس آیت اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ (۴) میں بھی کام نہ لینے ہی پر ملامت ہے۔ غرضیکہ

(۱) عقل مند نہیں بلکہ کھائے جانے والے چارے کی مانند ہے (۲) قوسین کے درمیان کی عبارت حضرت تھانوی کی نہیں بلکہ جامع وعظ مولانا عبدالکریم صاحب گمتھلوی کی ہے (۳) ''بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں پس وہ لوٹنے والے نہیں'' سورۃ البقرۃ:۲/۱۸ (۴) ''کیا ہم نے ان کی دو آنکھیں نہیں بنائیں سورۃ البلد:۹۰/۸۔

جن کی آنکھیں ہیں وہ شکر کریں اور جنکی بن گئی ہیں وہ زیادہ شکر کریں اور دونوں فریق ان سے کام لیں۔ جن چیزوں کا دیکھنا مفید اور موجب ثواب ہے اُن کو دیکھیں اور جن چیزوں کا دیکھنا مضر اور گناہ ہے ان سے بچیں یعنی اس کو ایسی جگہ استعمال نہ کریں کہ گناہ ہو۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ لَاتَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ (۱) پس کسی کی طرف تحقیر سے یا حرام نگاہ سے یا حرص سے نظر مت کرو۔ آنکھوں کا شکر فقط یہی نہیں کہ زبان سے اللہ کا شکر کہہ دیا کھانا کھلا دیا بلکہ یہ بھی شکر کا جزو ہے بلکہ بڑا جزو ہے کہ آنکھوں سے وہ کام لو جو حق تعالیٰ کو پسند ہو جیسا کہا گیا ہے ؎

افادتكم النعماء منى ثلثة يد ولسان والضمير المحجباء (۲)

لسان اور شفتین کے ذکر کا فائدہ

ایک بات بیان سے اور رہ گئی وہ یہ کہ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ کو مدرکات کے درمیان میں بیان کیا گیا ہے حالانکہ ان سے ادراک نہیں ہوتا۔

اس سے افادہ کی طرف اشارہ ہے یعنی ادراک کے بعد لسان ہے (۳) لوگوں کو فائدہ پہنچاؤ اور لسان کو دل اور آنکھ کے درمیان میں لانے سے زبان کا تعلق دونوں سے معلوم ہو گیا یعنی دونوں کے مدرکات کا اس سے افادہ ہو سکتا ہے۔

خلاصہ وعظ اور دعاء

حاصل ان آیات کا یہ ہے کہ اے انسان تو نہ تو نعمتوں کی وجہ سے متوجہ ہوا اور نہ مشقتوں سے تو نے عبرت حاصل کی، یہ بہت ہی بے جا بات ہے اس کا تدارک لازم ہے اب دعا ہے توفیق کیجئے کیونکہ یہ تو سب اسباب ہیں اور اصلی علت ان کی عنایت ہے اس لئے ان کی عنایت کا طلب کرنا لازم ہے ؎

(۱) ''آپ اپنی آنکھ اٹھا کر بھی اس چیز کو نہ دیکھیے''۔ سورۃ الحجر: ۱۵/ ۸۸ (۲) ''تمہیں میری تین نعمتوں سے زیادہ نفع پہنچتا ہے ہاتھ، زبان اور پوشیدہ ضمیر'' (۳) زبان۔

ایں ہمہ گفتیم ولیک اندر پیچ بے عنایات خدا ہیچم وہیچ
بے عنایات حق و خاصانِ حق گر ملک باشد سیہ ہستش ورق(۱)

البتہ اُن کی رحمت وعنایات حاصل کرنے کی ظاہری تدبیر یہ ہے کہ کسی مصلح کی جوتیاں سیدھی کی جاویں خاصان حق سے اس مقام پر یہی مراد ہے۔

اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں کے حقیقی شکر کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین۔ اور اس وعظ کا نام ازالۃ الغین عن آلۃ العین۔ رکھتا ہوں گو ازالہ اور آلہ کا وزن نہیں ملا، مگر مطلب تو ٹھیک ہے کہ آنکھوں پر جو کوتاہیوں کا پردہ پڑا ہوا ہے اس میں اس کو دور کیا گیا ہے اور عین غین علاوہ ہم قافیہ ہونے کے مجانس خطی بھی ہیں (۲) اور بناء وعظ سے تو نام کی مناسبت بالکل ہی ظاہر ہے (۳)۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین والصلوۃ والسلام علیٰ رسولہ محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔ (۴)

---

(۱) ''کہ گو ہم نے سب کچھ بتلایا لیکن عنایاتِ خداوندی نہ ہو تو ہم کچھ بھی نہیں۔ اللہ کی اور خاصانِ خدا کی عنایت کے بغیر اگر فرشتہ بھی ہو تو اس کا ورقِ زندگی بھی سیاہ ہے'' (۲) دونوں کا قافیہ بھی ایک ہے اور رسم الخط بھی ایک ہے صرف نقطہ سے فرق ہوتا ہے (۳) حضرت تھانوی کی اہلیہ کی آنکھوں میں موتیا ہو گیا تھا جس کا اپریشن کر کے وہ پردہ ہٹا دیا گیا جو بینائی میں رکاوٹ تھا اس لئے وعظ کے نام کی مناسبت بالکل ظاہر ہے (۴) اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس وعظ سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری آنکھوں پر پڑے پردوں کو ہٹا دے آمین۔

خلیل احمد تھانوی
۱۲ دسمبر ۲۰۱۷ء